یہ صحیح ہے کہ اقتدار حکومت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے روپے کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اپنی اور دوسروں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے جتنا روپیہ (جائز طریقے سے) حاصل کیا جائے درست ہے لیکن اگر روپیہ ہی مقصود بن جائے تو اس سے جتنا بڑا دینی نقصان پیدا ہوگا اس کے ذکر سے اسلام کا سارا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ حکومت کو لوگ خاص اپنا مقصد قرار دیں تو ایک بات بھی ہے لیکن حکومت کو اسلام کا مقصد قرار دینا تو کسی طرح صحیح نہیں۔

مسلمانوں نے جب اسلام، قرآن، دین اللہ، رسول ﷺ وغیرہ کو رسی واسطہ بنا کر حکومت کو مقصد قرار دے دیا تو رفتہ رفتہ تمام فرعونیت اندر گھس گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اسلام تو نکل گیا اور صرف حکومت رہ گئی۔ اس کے بعد دین و مذہب کے نام پر حصول اقتدار کے لئے جو خانہ جنگیاں ہوئیں وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت ہی افسوس ناک باب ہے۔ اب آپ اپنے ملک پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کو بغور دیکھئے۔ ہر اکھاڑ پچھاڑ، ہر جوتم بیزار، ہر جوڑ توڑ اور ہر جنگ وجدل میں صرف ایک ہی چیز کارفرما نظر آئے گی اور وہ ہے ہوس اقتدار و حکومت۔ اس تمام سر پھٹول میں جو قیمتی وقت، توانائی اور روپیہ برباد ہوتا ہے۔ اگر اسکا دسواں حصہ بھی تعمیری کاموں میں صرف ہو تو یقین کیجئے امت کے بیشمار مسائل حل ہو جائیں اور معاشرہ درست ہو جائے لیکن مقصد تو بن گیا ہے حصول حکومت و اقتدار، اور اسی کو اسلام کا مقصد قرار دیدیا گیا ہے اس لئے اصل مقصد تو پیچھے رہ گیا بلکہ تقریباً آٹے میں نمک کے برابر رہ گیا۔ (حقیقت صرف اتنی ہے کہ دین سے قوت حاصل ہوتی ہے لیکن سمجھا یہ گیا ہے، کہ قوت سے دین حاصل ہوتا ہے) جس دین کا مقصد قوت و اقتدار ہو اس کا حشر یہی ہوتا ہے کہ دین کی راہ سے آنے والی قوت اسی دین کو فنا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر مقصود صرف دین ہو جو اصلاح معاشرہ کا دوسرا نام ہے تو حکومت ثانوی اور ناگزیر علت کی حیثیت سے آجائے جب بھی اور نہ آئے جب بھی دین اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

افتاء کونسل کا قیام

پچھلے دنوں جامعہ اسلامیہ کورے وال کے مہتمم علامہ محمد اعظم سعیدی نے پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج کو اپنے ادارہ کی افتاء کونسل کا صدر مقرر کیا ہے۔ جبکہ دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی، اس کونسل کے ممبر ہیں۔ دینی رہنمائی کے لئے افتاء کونسل سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ رابطہ کیلئے:

مجلس التفسیر کا پوسٹل ایڈریس اور ای میل دونوں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

قریش مکہ .... عالم میں انتخاب

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی

استاذ عربی زبان وادب

شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی

اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ورسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت خاندان قریش سے ہوئی۔ قریش مکہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بعثت سے قبل پورے جزیرہ نمائے عرب پر قریش مکہ کا اپنا ایک مخصوص وضع کا مذہبی و سیاسی اور کسی حد تک ریاستی اقتدار قائم تھا۔ یہ نظام مذہبی و سیاسی اقتدار کا ایک ملغوبہ تھا۔ اس کے اثرات لوگوں کے طور طریقوں، رہن سہن، طرز زندگی اور جملہ دیگر شعبہ ہائے حیات شخصی و اجتماعی پر حاوی وطاری تھے۔ قریش کو اہل اللہ کے عظیم الشان خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس طرح چونکہ ان کا احترام ایک مذہبی اور اعتقادی نوعیت کی روایت اور معاملہ تھا اس لئے عرب، اپنی مرضی، آزادی اور خوش دلی سے قریش مکہ کا بے پناہ احترام کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں کسی پر بھی کسی طرح کا کوئی دباؤ، جبر یا اکراہ کی کوئی صورت موجود تھی نہ ہی ممکن۔ قریش مکہ کو یہ مقام و مرتبہ خانہ کعبہ کی ولایت کے باعث حاصل ہوا تھا۔ سطور ذیل میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ عالم عربی کی نگاہ میں قریش مکہ کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ تا کہ یہ پہلو پوری طرح سے نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آسکے کہ آخری بعثت کے لئے قبیلہ قریش کے انتخاب کی وجہ بادی النظر میں کیا سمجھ آتی ہے۔

قریش کا پیشوایانہ کردار

قریش مکہ عالم عربی کے لئے پیشوا کا درجہ رکھتے تھے۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں سب سے زیادہ عزت و وقار قریش مکہ کو ہی حاصل تھا۔ کسی اور قبیلہ کو اس کے ہم پلہ ہونے یا اس سے ہمسری کا کوئی دعویٰ نہ تھا۔ اگر کسی کے دماغ میں کبھی یہ سودا سمایا بھی ہوگا تو محض لا حاصل اور ناقابل اعتناء ہی رہا ہوگا۔ ذرا زیادہ واضح لفظوں میں قریش مکہ شرف و بزرگی کے معاملے میں

پورے عرب میں لا ثانی اور ایک اجارہ دار قبیلہ سمجھا اور مانا جاتا تھا۔ جرجی زیدان کی حسب ذیل رائے اس ضمن میں بہت معتدل و متوازن ہے اور اپنے اندر حقیقت کا وزن رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں :

''عرب کے قبائل میں قریش کے گھرانے کا رتبہ ایسا تھا جیسا بنی اسرائیل میں ''لادیوں'' کا مرتبہ تھا۔ انہیں بھی وہی امتیازات حاصل تھے جو ان کو اپنی قوم میں تھے۔ یہ امتیازات و مراتب عیسائیوں کے یہاں کے کاہنوں کے مراتب سے ملتے جلتے تھے۔ وہ سب پر حکمران تھے اور ان پر حاکم بالادست کوئی شخص نہ تھا۔(۱)

یہ امتیاز ان کو اس وجہ سے حاصل ہوا کہ خانہ ' کعبہ کے متولی تھے۔ اور تولیت کعبہ کے حقدار یوں ہوئے کہ بنی اسماعیل تھے۔ مگر آخر آخر میں نظر آنے والا یہ رتبہ تو کیا، تاریخ کے ادوار میں ذرا پیچھے چلے جائیں تو بنی اسماعیل کا تذکرہ بھی کم کم ہی ملتا ہے۔ رفعت و منزلت کا یہ عظیم انقلاب ۴۴۰ء میں آ کر برپا ہوا۔ اب تک اپنی جمعیت میں قوت و تحکم اور غلبہ و اقتدار سے محروم ہی چلے آئے تھے۔ بس روحانی معاملات میں کسی قدر ان کو بھی شریک مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں فرزندوں، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی اولاد میں نبوت و رسالت مقدر تھی۔ بنی اسحاق میں تو زمانوں نبوتیں اور رسالتیں آتی رہیں۔ اس حوالے سے ادھر بنی اسماعیل اپنی وحدت و شناخت سمیت نسبتاً گوشہ ' گمنامی میں گم رہے۔ کئی کئی پشتوں کے بعد کوئی ایک یا دو نامور بزرگ ملتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت اور یاد کو ازسر نو زندہ اور تازہ کر دیا۔ مثلاً عدنان اور معد بن عدنان۔ مگر پھر وہی کنج قفس اور گوشہ ' گمنامی۔ اس طرح زمانوں بعد آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی کے شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے اور پھر سے دب جانے میں بھی قدرت کی یہ حکمت و مصلحت کارفرما نظر آتی ہے کہ بنی اسماعیل اپنی اصل شناخت سے محروم ہو کر کہیں اپنے نسب و نسبت کے معاملے میں کسی ابہام کا شکار نہ ہو جائیں۔ چونکہ آخری بعثت، یعنی نبی موعود کی آمد، انہی میں سے ہونا مقدر تھی۔ یہ بار امانت ابھی ان کی اس جداگانہ اور ممتاز حیثیت اور شناخت کے سر ہی تھا کہ وہی حقیقی ''بنی اسماعیل'' ہیں۔ لہٰذا اس امتیازی شناخت کا نبی موعود کی بعثت سے قبل مٹ جانا منشائے الٰہی میں ہی نہ تھا۔

قریش اپنے باہمی اختلافات اور عہدوں کی مختلف ہاتھوں میں تقسیم کے باعث خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کوئی بڑی تبدیلی لانے کے قابل وہ نہ رہے جیسی تبدیلیاں

عمرو بن لحی اور قصی بن کلاب کے ہاتھوں ہوتی ہوئی ہمیں نظر آتی ہیں۔ دراصل ان دونوں کے ہاتھوں میں ساری قوت مجتمع اور مرتکز ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ عہد جاہلی کے اعتقاد کی رو سے صحیح معنوں میں یہی دونوں عربوں کے طاقتور ترین ''احکم الحاکمین'' ہوئے ہیں۔ ان دو میں سے بھی اول الذکر زیادہ خود سر، طاقتور اور دینی اقدار سے بیگانہ تھا۔ چنانچہ اتنی بڑی تبدیلی لانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے زیر اثر عربوں نے اپنے جد امجد حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دیئے ہوئے دین و پیغام توحید کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی کی راہ کو اختیار کر لیا۔ مگر خانہ کعبہ کی اپنی مرکزیت اور اس کی ولایت کے باعث قریش کی اب بھی بڑی شان باقی تھی اور ان کو عزت و احترام کی نظر سے ہی دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ بڑی حد تک اب بھی یہ عربوں میں احکم الحاکمین ہی کا درجہ رکھتے تھے۔ زہیر بن ابی سلمی مری کے الفاظ میں اس کے وقتوں تک قریش کی عظمت و شوکت کا عالم یہ تھا۔ کہتا ہے :

متی یشتجر قوم تقل سرواتهم	هم بيننا فهم رضا و هم عدل
هم جددوا احكام كل مضلة	من العقم لا يلفى لامثالها فصل
بعزمة مامور مطيع و امر	مطاع فلا يلفى لحزمهم مثلُ
ولستُ بلاق بالحجاز مجاورا	ولا سفرا الا له منهم حبلُ
بلاد بها عزوا معد و غيرها	مشاربها عذب و اعلامها ثملُ
هم خير حي من معد علمتهم	لهم نائل في قومهم و لهم فصلُ(۲)

☆ جب کسی قوم میں اختلافات پھوٹ پڑتے ہیں تو ان کی سربرآوردہ شخصیات ایک ہی بات کرتی ہیں، وہ لوگ یعنی قریش، ہمارے درمیان حَکَم ہیں۔ ان پر سب راضی و خوش ہیں اور وہی عادل بھی ہیں۔

☆ انہوں نے ہر گمراہ کن اور ہلاکت آفریں جنگ کے احکام کی تجدید کر کے انہیں از سر نو مرتب کر دیا ہے، ان کے جیسا فیصلہ زمانے میں کہیں نہیں ملتا،

☆ ایسے واجب حق کے تحت جو مامور اور راسخ ہے، اور آمر بھی ہے اور مطاع بھی، اور ان کے حزم و احتیاط کی کہیں مثال نہیں ملتی،

☆ اور میں حجاز کے اندر جوار کعبہ میں اگر سکونت رکھنا چاہتا ہوں یا اس علاقے میں سفر ہی کرنا چاہوں تو ہر کہیں ان کے معاہدات کا جال پھیلا ہوا ہے جس کا مجھے سامنا ہوگا،

☆ یہ ایسے علاقے ہیں کہ بنو معد وغیرہ یہاں پوری طرح سربلند و مقتدر رہیں، ان کے چشمے تو میٹھے ہیں ہی، ان کے پہاڑ بھی اقامت گاہیں ہیں،

☆ بنو معد میں یہ لوگ (قریش مکہ) سب سے اچھے قبیلے کے لوگ ہیں، میں انہیں جانتا ہوں، اپنی قوم کے یہ مانے ہوئے سردار ہیں اور بزرگی و برتری ان کو اس طور حاصل ہے کہ ان کی بات حتمی اور حرف آخر ہوتی ہے۔

تاریخی پس منظر

کعبہ معظمہ کی ولایت صدیوں بنی خزاعہ کے ہاتھوں میں رہنے کے بعد یعمر بن عوف الشداخ کے فیصلے کے تحت قصی کو ملی تھی۔ مکہ کی امارت بھی اسی کو ملی۔ ساتھ ہی سیاسی و روحانی اور سماجی پیشوائی و اقتدار دونوں قصی اور قبیلہ' قریش کو مل گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شرف و بزرگی اور تقدس و حرمت کا تاج پورے عالم عربی نے خزاعہ کی جگہ قصی اور قبیلہ' قریش کے سر پہ سجادیا اور پھر کسی جانب سے کوئی مزاحمتی یا مخالفانہ آواز تک نہ ابھری۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی پس منظر میں اس اجمال کی تفصیل اس طور کی جائے کہ عالم عربی کی نگاہ میں قریش مکہ کے سماجی مقام و مرتبہ کی بہتر انداز سے وضاحت ہو سکے۔ اس تفصیل کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل ہیں:

بنائے کعبہ کے بعد حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام اس کے اولین متولی ہوئے۔ چونکہ آپ علیہ السلام ہی اس کے بانی بھی تھے اس لئے کسی کے لئے اس امر میں حارج ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ توریت کے بیان کے مطابق آپ علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس (۱۳۷) برس ہوئی۔ (۳)

اللہ تعالیٰ نے ذریت ابراہیمی میں برکت کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاں بارہ نامور بیٹوں کی ولادت کی بشارت ملی تھی۔ چنانچہ توراۃ نے ان بارہ فرزندوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ (۴)

آپ علیہ السلام کی اولاد میں نابت اور قیدار بہت مشہور اور نامور ہوئے ہیں۔ کعبہ معظمہ کی ولایت آپ علیہ السلام کے بعد نابت کو منتقل ہوئی۔ پھر ان سے، ایک روایت کے مطابق ان کے ماموں اور دوسری روایت کے تحت ان کے نانا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سسر مضاض بن عمرو جرہمی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح کعبہ معظمہ کی ولایت اور مکہ

مکرمہ کی امارت بنو اسماعیل کے بجائے بنو جرہم کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ مسعودی کا بیان ہے:

لما قبض اسماعیل قام بالبیت بعده نابت بن اسماعیل، ثم قام من بعده اناس من جرهم لغلبة جرهم علی ولد اسماعیل. وکان ملک جرهم یومئذ الحارث بن مضاض وهو اول من ولی البیت. (۵)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جب انتقال ہو گیا تو آپ علیہ السلام کے بعد آپ علیہ السلام کے بیٹے نابت، بیت اللہ شریف کے نگران اور والی ہو گئے۔ پھر ان کے بعد بنو اسماعیل پر چونکہ بنو جرہم کو عددی لحاظ سے برتری حاصل تھی اس لئے بیت اللہ شریف کی نگرانی کے فرائض انہی میں کے کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ ان دنوں بنو جرہم کا رئیس حارث بن مضاض تھا، اس لئے یہی شخص پہلے پہل کعبہ معظمہ کا والی بنا۔

ابن ہشام کی روایت بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے۔ بجز اس کے حارث بن مضاض جو کہ رشتے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بچوں کے ماموں ہوتے ہیں، کی بجائے آپ علیہ السلام کے سسر مضاض بن عمرو جرہمی کو اولین متولی بتایا ہے۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے:

عن محمد بن اسحاق، قال: لما توفی اسماعیل بن ابراهیم ولی البیت بعده ابنه نابت بن اسماعیل ما شاء الله ان یلیه ثم ولی البیت بعده مضاض بن عمرو الجرهمی. (۶)

محمد بن اسحاق سے روایت ہے۔ کہتے ہیں: جب اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کا انتقال ہو گیا تو آپ علیہ السلام کے بعد آپ کے فرزند نابت بن اسماعیل، جب تک قدرت نے ان کو موقع دیے رکھا، خانہ کعبہ کے متولی رہے۔ پھر ان کے بعد مضاض بن عمرو جرہمی خانہ' کعبہ کے متولی ہو گئے۔

گزرتے وقت کے ساتھ بنو اسماعیل کی آبادی میں اس قدر اضافہ ہوتا گیا کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین ان پر تنگ ہونے لگی۔ لہذا قریبی علاقوں کی طرف نقل مکانی شروع ہو گئی۔ اور ہوتے ہوتے بنی اسماعیل پورے جزیرہ نما کی وسعتوں میں پھیل گئے۔ ابن ہشام کا بیان ہے:

نشر الله ولد اسماعیل بمکة و اخوالهم من جرهم ولاة البیت والحکام بمکة لا ینازعهم ولد اسماعیل فی ذلک لخئولتهم و قرابتهم و اعظاما للحرمة ان یکون بها بغی او قتال فلما ضاقت مکة علی ولد اسماعیل، انتشروا فی البلاد. فلا یناوون قوما الا ظهرهم الله علیهم بدینهم فوطئوهم ثم ان جرهما بغوا بمکة و استحلوا خلالا من الحرمة فظلموا من دخلها من غیر اهلها و اکلوا مال الکعبة الذی یهدی لها، فرق امرهم فلما رات بنو بکر بن عبد مناة بن کنانة و

غبشان من خزاعة ذلک اجمعوا لحربهم و اخراجهم من مکة فآذنوهم بالحرب فاقتتلوا فغلبهم بنو بکر و غبشان. فنفوهم من مکة و کانت مکة فی الجاهلية لا تقر فيها ظلما و لا بغيا ولا يبغي فيها احد الا اخرجته (۷)

اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل کو مکہ مکرمہ میں خوب فروغ بخشا۔ اس اثناء میں ان کے ننہالی بنو جرہم بیت اللہ کے والی اور مکہ مکرمہ کے حاکم بنے رہے۔ بنو اسماعیل ننہالی رشتے کے احترام میں اور اس مقام پر بغاوت و سرکشی اور قتل و غارتگری کو نہایت نامناسب خیال کرتے ہوئے ان سے کسی طرح کا نزاع و تعرض نہ کرتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ میں نسل اسماعیلی زیادہ بڑھی تو وہ لوگ مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ وہ جدھر کا بھی رخ کرتے اللہ تعالیٰ دین کی برکت سے ان کو غالب کرتا اور باقی قومیں مغلوب ہو جاتیں۔ پھر مرور ایام کے ساتھ یہ ہوا کہ بنو جرہم کے دماغوں میں سرکشی کا سودا سما گیا۔ خانہ کعبہ کی حرمت کو پامال کرنے لگ گئے۔ باہر سے آنے والوں پر ظلم روا کر لیا۔ خانہ کعبہ کے لئے جو عطیات آتے وہ بھی کھانے اڑانے لگے تو ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب بنو بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ اور بنو خزاعہ کے غبشان نے یہ صورتحال دیکھی تو انہوں نے بنو جرہم سے جنگ کرنے اور ان کو مکہ مکرمہ سے نکال باہر کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ انہوں نے ان کو جنگ کے لئے للکار دیا۔ خوب رن پڑا۔ بنو بکر اور غبشان غالب آ گئے اور انہوں نے مکہ مکرمہ سے بنو جرہم کا صفایا کر دیا۔ عہد جاہلیت میں بھی مکہ مکرمہ کی شان یہ رہی ہے کہ ظلم و سرکشی کو یہاں کبھی پناہ و ٹھکانہ نہیں ملا۔ اور جب کبھی بھی کسی کے دماغ میں سرکشی کا سودا سمایا اس مقدس شہر نے اسے نکال باہر کر دیا۔

موقع کی مناسبت سے یہاں اس بات کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنو جرہم نے مکہ مکرمہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا تھا اور اس میں کئی تاریخی چیزیں دفن کر کے اس کے نشانات بھی مٹا دیئے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عمرو بن حارث بن مضاض جرہمی نے خانہ کعبہ کے دونوں ہرن اور اس کے کونے میں لگا ہوا پتھر (حجر اسود) نکال کر زمزم کے کنویں میں دفن کر دیا اور اپنے قبیلہ بنو جرہم کو ساتھ لے کر یمن چلا گیا (۸)

بنو جرہم کو مکہ مکرمہ سے بیدخلی اور وہاں کی حکومت سے محروم ہونے پر بڑا قلق ہوا۔ چنانچہ علامہ حموی نے بنو جرہم کے آخری متولی، جن کا نام اولین متولی کے نام سے ملتا جلتا ہے، عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کے حسب ذیل دکھ بھرے اشعار نقل کئے ہیں:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا   انیس و لم یسمر بمکة سامر
بلی نحن کنا اهلها فابادنا   صروف الليالي و الجدود العواثر (۹)

☆ لگتا ہے مقام حجون سے لے کر مقام صفا تک ہمارا کوئی آشنا تھا ہی نہیں، اور نہ کبھی کسی قصہ گو نے مکہ کی شبانہ محفلوں میں قصہ گوئی ہی کی ہے۔
☆ ہاں! کیوں نہیں، یقیناً ہم ہی اس کے باشندے تھے لیکن زمانے کی گردشوں اور ٹوٹی ہوئی قسمتوں نے ہمیں اجاڑ پھینکا۔

جدید محققین کی تحقیقات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح ہے۔ اس حساب سے مکہ مکرمہ میں قبیلہ جرہم کا وجود کوئی دو ہزار ایک سو برس تک رہا۔ اور ان کی حکمرانی لگ بھگ دو ہزار برس تک رہی۔ (۱۰)

جبکہ بنو خزاعہ کی حکمرانی اور ولایت کعبہ کی مدت علامہ یاقوت حموی نے حسب ذیل بیان کی ہے:

ثم وليت خزاعة البيت ثلاثمائة سنة يتوارثون ذلک کابرا عن کابر حتی کان اخرهم حليل بن حبشية بن سلول (۱۱)

پھر بیت اللہ شریف کی ولایت بنی خزاعہ کے ہاتھوں میں چلی گئی جو تین سو برس تک قائم رہی۔ بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا وارث ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر الامر میں حلیل بن حبشیہ بن سلول متولی ہوا۔
صاحب مروج الذہب، مسعودی کے بیان سے بھی اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ (۱۲)

یعمر بن عوف الشداخ کا فیصلہ

بنو خزاعہ میں سے آخری والی کعبہ معظمہ، حلیل بن حبشیہ کے عہد میں آ کر حالات نے ایک اور بڑا پلٹا کھایا۔ یہی وہ وقت ہے جب بنی اسماعیل کے معروف قبیلے قریش میں سے قصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔ قصی نے حلیل بن حبشیہ کی بیٹی حبی سے نکاح کر لیا جس سے اس کے چار بیٹے ہوئے۔ پھر قصی کی قوت و شوکت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر بنو خزاعہ کا اقتدار بھی مائل بہ زوال اور قریب الغروب ہوتا گیا۔

پھر ایک حج کے موقع پر قصی نے بنی صوفہ سے منیٰ کی جانب روانگی کا پروانہ دینے کا منصب یہ کہہ کر چھین لیا کہ بنی اسماعیل اس منصب کے زیادہ اہل اور حقدار ہیں۔ (۱۳)

روایت کے مطابق خزاعہ اور بنو بکر نے یہ دیکھا تو انہیں قصی سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ قصی نے ان کو بھی للکار دیا اور اپنی پوری جمعیت ان کے مقابلے پر لا کھڑی کی۔ ادھر بنو خزاعہ بھی اپنے حامیوں اور حلیفوں کو لے کر میدان میں اتر آئے اور جنگ کی ٹھان لی۔ جنگ ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا۔ جب فریقین کا بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہو چکا تو جنگ بندی کا داعیہ پیدا ہوا۔ دونوں فریق اس امر پر رضامند ہو گئے کہ فریقین کے درمیان جھگڑا چکانے کے لئے کسی عرب کو "حَکَم" مقرر کیا جائے گا اور جو بھی فیصلہ وہ کرے گا، فریقین اس کے آگے سر تسلیم و جبین نیاز خم کر دیں گے۔ مشہور مؤرخ علامہ طبری کا بیان ہے:

ثم انهم تداعوا الى الصلح الى أن يحكموا بينهم رجلا من العرب فيما اختلفوا فيه ليقضي بينهم ، فحكموا يعمر بن عوف .... فقضىٰ بينهم بأن قصيا أولى بالكعبة و أمر مكة من خزاعة و أن كل دم أصابه قصي من خزاعة و بني بكر موضوع يشدخه تحت قدميه و أن ما أصابت خزاعة وبنو بكر من قريش و بني كنانة و قضاعة ففيه دية مؤداة وأن يخلى بين قصي و بين الكعبة و مكة . فسمي يعمر بن عوف يومئذ الشداخ لما شدخ من الدماء ووضع منها . فولي قصي أمر مكة. (١٤)

پھر دونوں فریق اس شرط پر جنگ بندی پر آمادہ ہوئے کہ باہمی جھگڑا چکانے اور پر امن تصفیہ کے لئے عربوں میں سے ہی کسی کو "حَکَم" مقرر کریں گے تاکہ وہ ان کے درمیان باعث نزاع و مختلف فیہ معاملے کا فیصلہ کر دے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے یعمر بن عوف کو حَکَم مقرر کیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ

(۱) قصی، کعبہ کی ولایت اور مکہ کی امارت کا خزاعہ کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے،

(۲) قصی نے خزاعہ اور بنو بکر کا جو خون بہایا اسے وہ باطل قرار دیتے ہوئے اپنے پاؤں کے نیچے روندتا ہے،

(۳) خزاعہ اور بنو بکر نے قریش اور بنو کنانہ و بنو قضاعہ کا جو خون بہایا اس کی دیت لازم ہے، اور یہ کہ

(۴) قصی بن کلاب اور کعبہ و مکہ کے درمیان حائل ہر رکاوٹ دور کر دی جائے۔

اسی فیصلے کے باعث یعمر بن عوف کو اسی دن سے شداخ (۱۵) کہا جانے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے خزاعہ اور ان کے حلیفوں کے خون رائیگاں قرار دے دیئے تھے۔ اس طرح قصی کو بیت اللہ کی ولایت اور مکہ مکرمہ کی امارت حاصل ہو گئی۔

قصی اپنے دور کے مردِ آہن ثابت ہوئے۔ ولایت و امارت کے حصول کے بعد ان کی عظمت و شوکت میں لازوال اضافہ ہوا۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ بنی اسماعیل کی شیرازہ بندی کر کے ان کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کیا۔ ان کی اصل حیثیت اور عظمت کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اور صدیوں کی محرومی اور مایوسی کے اندھیروں سے ان کو نکال کر ایک قابل رشک اور ناقابل تسخیر مقام و مرتبہ کا ان کو وارث بنا دیا۔ کعبۂ معظمہ کی ولایت اور مکہ مکرمہ کی امارت کا ان کا چھنا ہوا اور غصب شدہ حق واپس لے کر بنی اسماعیل کے مذہبی و روحانی اقتدار کو بھی پھر سے پوری طرح بحال کر دیا۔ منصور پوری لکھتے ہیں:

قصی نے جو عدنان دوم سے پندرہویں پشت میں ہے، پھر مکہ پر قبضہ حاصل کر لیا اور اس نے مکہ میں مشترکہ حکومت کی بنیاد ۴۴۰ء میں رکھی۔ (۱۶)

اس اقدام سے عالم عربی میں قریش مکہ کو وہ عزت و عظمت اور تفوق و برتری حاصل ہو گئی کہ عہد جاہلی کے شعراء ان کے قصیدے گاتے تھے۔ قریش کو چونکہ ایک واضح فیصلے کے باعث حق ولایت ملا تھا اس لئے ان کو حَکَم کے اس فیصلے کی قانونی اور اخلاقی پشت پناہی کے باعث پچھلے والیانِ کعبہ کے دونوں خاندانوں کے مقابلے میں زیادہ مستحکم اور مضبوط پوزیشن حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا آلِ اسماعیل ہونا ایک ایسی ڈھال بن گیا تھا کہ جس نے ان سے ولایت کعبہ کا منصب چھیننے یا ہتھیا لینے کے بارے میں سوچنا بھی کسی کے لئے ممکن نہ چھوڑا تھا۔ یہی کچھ وجوہات تھیں کہ زہیر بن ابی سلمیٰ مری ان کی شان و شوکت اور عظمت و رفعت کا حسب ذیل الفاظ میں نقشہ پیش کرتا نظر آتا ہے:

سعى بعدهم قوم لكي يدركوهم　　فلم يفعلوا ولم يليموا و لم يألوا

فما يك من خير أتوه فانما　　توارثه آباءُ آبائهم قبل (١٧)

☆ان (قریش) کے پیچھے ایک اور قوم نے بھی کوشش کی کہ ان کے شرف و بزرگی کے مقام تک پہنچ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکے، اور چونکہ ناممکن تھا اس لئے ملامت زدہ بھی نہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی طرف سے تو کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہیں کی،

قریش مکہ .... عالم میں انتخاب　　ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی

☆ تو جو کچھ بھی بھلائی کے کام ان سے صادر ہوتے ہیں وہ سب دراصل ان کے آباء واجداد کی قائم کردہ روایت ہی کا تسلسل ہیں۔

عالم عربی میں قریش مکہ کا احترام الگ تھا اور انہوں نے جزیرہ نما کے دور دراز علاقوں کے مقامی سرداروں سے امن وامان قائم رکھنے اور تجارتی کاروانوں کو محفوظ راہداری دینے کے لئے حلف الگ لے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایلاف کے نام سے قریبی ممالک سے تجارتی راہداری کے لئے امن معاہدات کر لینے کے بعد قریش نے شام، حبشہ، یمن اور عراق کی جانب تجارتی کاروان روانہ کئے۔ عرب قبائل کے انہی احلاف اور دیگر ممالک سے تجارتی امن معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے مطرود الخزاعی کہتا ہے:

یا یھا الرجل المحول رحلہ هلا نزلت بآل عبد مناف
الآخذین العهد من آفاقها و الراحلین برحلة الإیلاف (۱۸)

☆ اے شخص جس کی سواری کا رخ پھیر دیا گیا، تو عبد مناف کی ال کے ہاں کیوں نہ گیا۔
☆ وہی جنہوں نے ہمارے سرداروں کے ساتھ معاہدے کر رکھے ہیں اور وہی جو تجارتی امن معاہدوں کے تحت سفر کرتے ہیں۔

ان امور سے یہ چیز تو واضح ہو جاتی ہے کہ قریش کی بقیہ عالم عرب پر فوقیت اور بالادستی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ اور آپ ﷺ کا خاندان قریش میں سے ہونا آپ ﷺ کو باقی عالم عربی سے نمایاں کرتا اور ایک ممتاز مقام کا حامل ظاہر کرتا ہے۔ البتہ خود قریش کے اندر بھی رقابتوں اور خلفشار کا ایک زہرناک عنصر موجود تھا۔ لہٰذا ان کی اندرونی دیرینہ رقابتوں اور حریفانہ کشمکش کے پیدا کار عوامل پر بھی یہاں ایک نگاہ مناسب ہوگی۔

مناصب بیت اللہ کی تقسیم پر مبنی فیصلہ

اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر قصی نے اپنے فرزند عبدالدار کو اپنا جانشین بنایا اور اپنی پوری قوت وشوکت مجتمع حالت میں اس کے سپرد کر دی۔ قصی کی ہدایت کے مطابق عبدالدار کو ولایت کعبہ کا شرف تو مل گیا مگر اس کے بھائی اس صورت حال سے زیادہ خوش نہ تھے۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ یہ دوریاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ ایک روز ایسا آیا کہ چچا زاد ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے۔ اور بیت اللہ شریف سے متعلق مناصب کی از سر نو تقسیم کی خاطر بنی عبد مناف اور

بنی عبدالدار کے مابین حَکَم کے تقرر کی ضرورت پیش آگئی۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ بنی عبد مناف کی سیادت ان دنوں عبد شمس بن عبد مناف کر رہے تھے جو ان سب میں سب سے زیادہ سن رسیدہ شخص تھے۔ دوسری طرف بنی عبدالدار کے معاملات عامر بن ہاشم کے ہاتھ میں تھے۔ (۱۹)

قریش کے باقی قبائل بھی فریقین کے ساتھ ہی تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بنی عبد مناف امور تولیت کو سنبھالنے اور بہتر طور پر چلانے اور نبھانے کے زیادہ اہل ہیں۔ اور کچھ یہ سمجھتے تھے کہ قصی نے اپنی زندگی میں جو تقسیم کر دی تھی اس سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (۲۰)

بنی عبد مناف نے حسب روایت خوشبو سے بھرا ہوا ایک پیالا لا کر اس میں اپنے ہاتھ ڈبوئے اور قسم کھائی کہ جب تک سمندر کے پانی میں اپنی گھاس کو تر رکھنے کی صلاحیت باقی ہے اپنے رفقاء کو نہ رسوا ہونے دیں گے اور نہ ہی سپردگی دیں گے۔ اسے معاہدہ مُطَیَّبِیْن (خوشبو لگانے والوں کا معاہدہ) کے نام سے موسوم کیا گیا۔

دوسری طرف فریق مخالف نے بھی اسی طرح کی قسم کھا کر آپس میں معاہدہ کر لیا۔ بجز اس کے کہ انہوں نے خوشبو سے ہاتھ تر نہ کئے تھے۔ اسے "معاہدۂ احلاف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۲۱)

آگے کی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ قیسی لکھتے ہیں:

ثم سلت السیوف واشرعت الاسنة وکادت الحرب ان تنشب فتأکل نارها القوم. ولما ادرک الشاعب مداه مشی من ذوی المروءة بین الفریقین من سعوا له فتداعوا الی الصلح ابقاء علی قریش. وهکذا حکموا بینهم من ارتضوا بحکمه. فحکم بان یعود لکلبنی عبدالدار تراثهم من حجابة البیت والندوة وعقد اللواء. یعود بنی عمهم بالسقایة والرفادة الحاج. (۲۲)

پھر تلواریں سونت لی گئیں اور نیزے تول لئے گئے۔ اور قریب تھا کہ جنگ بھڑک اٹھتی اور اس کی آگ قوم قریش کو چاٹ جاتی۔ سب تیاریاں جب مکمل دیکھیں تو اس کی ہولناکیوں کا اندازہ کر کے طرفین میں سے کچھ جی دار لوگ اٹھے اور قریش کی بقاء کے عظیم تر مقصد کے تحت انہوں نے صلح کا داعیہ بیدار کیا۔ اس طرح سے انہوں نے فیصلے کیلئے اپنے باہم ایسے حَکَم کا انتخاب کیا جس کے حکم وفیصلے کو قبول کرنے پر سب رضامند تھے۔ اس نے فیصلہ دیا کہ بنی عبدالدار کے پاس حجابت البیت، ندوہ کی امارت اور جھنڈا باندھنے کا اختیار رہنے دیا جائے۔ جبکہ ان کے چچا زاد یعنی بنی عبد مناف سقایہ اور رفادۃ الحاج (حاجیوں کی مہمان

توازی) کے مناصب سنبھال لیں۔

اس طرح فریقین جب کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹنے کی قسمیں کھا کر میدان جنگ میں اتر آئے تھے اور جنگ کی ٹھان لی تھی تب بھی منصب حَکَم نے ان کو تباہ کن جنگ کی ہولناکیوں سے بچا کر امن و آشتی کی راہ پہ ڈال دیا اور اس موقع پر بھی حَکَم کے فیصلے سے انحراف کی طرف کسی بھی فریق کا دھیان تک نہ گیا۔

حَکَم کے فیصلے کی عظمت

حَکَم کا فیصلہ مبنی برحق مانا جاتا تھا۔ عربوں کے نزدیک "حَکَم" سچائی اور حقیقت حال کی دریافت کا سب سے بڑا اور معتبر ذریعہ تھا۔ حَکَم، فریقین کے بیانات، دلائل و شواہد اور جملہ آثار و قرائن پہ گہرے غور و خوض کے بعد جو بھی فیصلہ صادر کر دیتا وہی ان کے نزدیک حق ہوتا اور سچ ہوتا تھا۔ اسی طرح حَکَم کسی چیز کو جائز و ناجائز یا حلال و حرام قرار دینے کا بھی مجاز تھا۔ بایں معنی یہی ان کا "شارع" تھا جس کے حکم سے سرمو انحراف کو روا نہیں رکھتے تھے۔ انکار یا فرار کے آثار دور دور تک ان کے وہم و خیال میں کہیں نہیں ملتے۔ اب یہ کیفیت تو پورے عرب میں پائی جاتی تھی کہ اپنے اپنے ہاں کے حَکَم کے آگے سر تسلیم اور جبین نیاز خم رکھتے اور خود ان کے سردار اور والیان قوم، والیان کعبہ کو اپنا حَکَم اعلیٰ مانتے اور ان کے آگے سرنگوں رہتے تھے۔ جیسا کہ اس امر کا اظہار زہیر بن ابی سلمیٰ مزنی کے اس شعر سے ہوتا ہے جو اس نے قریش مکہ کی مدح میں کہا۔ کہتا ہے:

متى يشتجر قوم تقل سرواتهم　　　هم بيننا، فهم رضاً وهم عدل [۴۳]

☆ جب کسی قوم میں اختلافات پھوٹ پڑتے ہیں تو ان کی سربرآوردہ شخصیات ایک ہی بات کرتی ہیں: وہ لوگ یعنی قریش، ہمارے درمیان حَکَم ہیں۔ ان پہ سب راضی و خوش ہیں اور وہی عادل بھی ہیں۔

اب یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ قریش کی یہ عظمت اس وقت بھی قائم تھی جب ولایت کعبہ کے مناصب و وظائف قبیلۂ قریش کی مختلف شاخوں میں بٹ جانے سے اہل الامر یعنی اقتدار اعلیٰ تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار تھا۔ اور کسی ایک فرد کے تحکم و بالادستی قائم کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کی راہ میں کمزور ہی سہی مگر کئی مزاحمتی وجود حائل ہو چکے تھے۔ جملہ اختیارات اگر کسی ایک ہی شخص کے پاس مرتکز ہو جاتے اور دیگر شخصی امتیازات اور انسانی خوبیوں و کمالات کا بھی وہ شخص حامل ہوتا تو اس کی ایک ایسی غیر معمولی حاکمیت اعلیٰ قائم ہو جاتی تھی کہ عیاذاً باللہ الوہیت کا گماں ہونے لگتا تھا۔

ہدایت ایزدی کے تحت یا خالص الہامی دین کے زیر اثر قائم ہونے والی حاکمیت اعلیٰ کا مزاج

بالکل جداگانہ نوعیت کا ہے۔ اس سے بیگانگی کے باعث روئے زمیں پر انسانی خدائی اور فرعونیت کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی ہر خواہش قطع نظر اس سے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز، موزوں ہے یا ناموزوں دین کے اساسی ضابطوں کی طرح معتبر اور مستند گنی اور مانی جاتی ہے۔ عربوں میں اصلاً یہی چیز پائی جاتی تھی۔ یہی چیز حکم جاہلیت کی اصل روح ہے۔ قرآن حکیم نے جاہلیت کے اسی حکم کا تذکرہ حسب ذیل آیت کریمہ میں کیا ہے:

أفحكم الجاهلية يبغون و من أحسن من الله حكما لقوم يوقنون [۴۴]

آیا یہ لوگ عہد جاہلیت کی طرز کے حکم و فیصلہ کے آرزومند ہیں اور یقین رکھنے والوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہو کون سکتا ہے۔

یہ جاہلیت ہی کا طرہ/امتیاز ہے کہ عام افراد انسانی کو ایسے لامحدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے فرستادہ انبیاء کرام اور رسولان عظام ہی کے لئے اسلام نے مختص کر دیے ہیں۔ جاہلیت کی طرز زندگی کی یہی وہ ادا ہے جس کے باعث اہل اللہ نے ہر دور میں اسے للکارا ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ و بندش کے لامتناہی اختیارات صرف ذات تعالیٰ ہی کو سزاوار ہیں۔ اس کے برعکس جاہلی فکر کا کارنامہ ملاحظہ کیجئے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں قصی کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنے عہد میں وہ عربوں کا "رب الحکم" ہو گیا تھا۔ [۴۵]

اسی طرح علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

قریش، قصی اور اس کے حکم کو باعث خیر و برکت جانتے تھے چنانچہ جب کسی مرد و عورت کا نکاح ہوتا تو قصی کے گھر میں ہوتا، کسی بھی اہم معاملے کا فیصلہ کرنے کیلئے مشورہ کرنا ہوتا تو اسی کے گھر میں، کسی جنگ کیلئے جھنڈا باندھنا ہوتا تو وہ بھی اسی کے گھر میں اس کا کوئی بیٹا باندھتا تھا۔ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد لڑکیوں کو اوڑھنی اسی کے گھر میں دی جاتی تھی۔ قصی کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد بھی قصی کا حکم "دین متبع" یعنی لائق اتباع دین کا درجہ رکھتا تھا۔ [۴۶]

علامہ طبری لکھتے ہیں:

فكان امره في قومه من قريش في حياته وبعد موته كالدين المتبع، لا يعمل بغيره تيمنا بامره و معرفة بفضله و شرفه. [۴۷]

قریش میں قصی کا حکم اس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی "دین" "متبع" یعنی لائق اتباع و پیروی دین کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے شرف و بزرگی سے واقفیت کے باعث اور اس کے حکم کو خیر و برکت کے حصول کا ذریعہ ماننے کی وجہ سے اس کی خلاف ورزی نہ کی جاسکتی تھی۔

سطور ذیل میں ہم ایک ایسے قضیے کا ذکر بھی مناسب سمجھتے ہیں جس پر غور کیا جائے تو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ من حیث المجموع اس تمام تر عظمت و فضیلت کے حامل ہوتے ہوئے بھی قریش مکہ ہی کے کچھ لوگ اپنی خواہش نفس کے زیر اثر بے راہ روی کی طرف بھی مائل ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کے اپنے بنائے ہوئے اور تسلیم شدہ قوانین سے بھی گریز اور انحراف کا ارتکاب کر لیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے غلط کاریوں اور بے اعتدالیوں سے خالی ہرگز نہ تھے۔ وہ ایسی ہی کرتو گزرتے تھے مگر حالات اور عرب روایات جلد ہی بہتوں کو واپس ان کی راہ پر دھکیل دیتی تھیں اور پھر سے سیدھا کھڑا کر دیا کرتی تھیں۔

عبدالمطلب اور آپ کے چچا نوفل کا قضیہ

عبدالمطلب کے والد ہاشم بن عبد مناف تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے مدینہ منورہ میں بنو عدی بن نجار کی ایک سلمیٰ نامی خاتون سے شادی کی تھی اور شادی کے موقع پر یہ طے ہوا تھا کہ جب بھی اس لڑکی کے ہاں ولادت ہوگی تو اس کے ماں باپ کے ہاں ہی ہوگی۔ آپ کی شادی ہوگئی۔ جب اس کے ہاں ولادت کا وقت قریب آگیا تو آپ اپنی اہلیہ کو مدینہ میں ان کے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر خود شام چلے گئے۔ اور اسی سفر میں وہیں پر ان کا انتقال ہوگیا۔ ادھر آپ کی اہلیہ نے بیٹے کو جنم دیا۔ ننھیالی رشتہ داروں نے ہی آپ کے اس فرزند نو مولود کا نام شیبہ رکھ دیا۔ آپ کے بیٹے کی پرورش ننھیال میں ہی اُن کے ماموؤں کے زیر سایہ ہوتی رہی۔

ایک روز مدینہ میں کچھ بچے تیر اندازی کے ایک مقابلہ میں مشق کر رہے تھے۔ ان میں شیبہ بھی شامل تھے۔ شیبہ ان سب بچوں سے جیت گئے اور فرط انبساط میں کہا: میں بطحاء کے سردار ہاشم بن عبد مناف کا بیٹا ہوں۔ ایک راہگیر جو اس موقع پر موجود تھا اور یہ گفتگو سن رہا تھا نے یہ بات سنی تو مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ کے چچا "مطلب" کو اس پورے واقعے کی خبر کر دی۔ مطلب نے اطلاع ملتے ہی یہ عہد کر لیا کہ جب تک اپنے بھتیجے کو مکہ مکرمہ نہ لے آؤں گا اپنے گھر واپس ہی نہ جاؤں گا۔ چنانچہ مدینہ پہنچے اور اپنے بھتیجے کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا کر مکہ مکرمہ لے آئے۔ راستے میں لوگ آپ سے پوچھتے: یہ آپ کے پیچھے کون ہے؟ تو آپ ان کو جواب دیتے: "عبدی" یعنی میرا غلام۔ اسی کے باعث آپ کا نام شیبہ کی

بجائے "عبدالمطلب" مشہور ہو گیا تھا۔ (۲۸)

طبری لکھتے ہیں:

فلما قدم مكة وقفه على ملك ابيه و سلمه اليه . فعرض له نوفل بن عبدمناف في ركح له فاغتصبه اياه . فمشى عبدالمطلب الى رجالات قومه فسألهم النصرة على عمه . فقالوا لسنا بداخلين بينك وبين عمك. (۲۹)

جب آپ مکہ آئے تو آپ کے چچا نے آپ کے والد کی مسند اور ساری میراث آپ کے حوالے کر دی۔ مگر آپ کے ایک چچا نوفل بن عبد مناف آڑے آئے اور انہوں نے آپ کے حصے کے صحن کے ایک حصے پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ عبدالمطلب اپنی قوم کے نامور لوگوں کے پاس گئے اور اپنے چچا کے خلاف مدد چاہی۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کر دی کہ ہم آپ کے اور آپ کے چچا کے درمیان کسی طرح کی کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔

اس کا صاف مطلب یہی بنتا ہے کہ عربوں کا دستور اور ایک مسلمہ اصول تھا کہ چھوٹے، بڑوں کے معاملات طے کرنے یا ان میں کسی طرح کی مداخلت کے مجاز نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ قریش میں یہ دونوں بزرگ تر تھے اور ان دونوں میں سے بھی آپ ایک منصب عظیمہ کے حامل ہونے کے ناطے بالاتر تھے۔

آپ نے مجبور ہو کر اپنے ماموؤں سے اس ظلم و زیادتی کی شکایت کی۔ اس شکایت کے نتیجے میں ابو سعد بن عدی النجاری، اسی (۸۰) شاہسواروں کی ایک جماعت لیکر چڑھ آیا۔ عبدالمطلب استقبال کیلئے آگے بڑھے اور ان کو گھوڑوں سے اترنے کا کہا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر گھوڑوں کی پیٹھ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ جب تک نوفل سے نمٹ لیں یہ حالت نہ بدلیں گے۔ پھر قریش کی دانش گاہ میں پہنچے جہاں نوفل دوسرے روٴسائے قریش کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ ابو سعد نے اس کے سر پر تلوار سونت کر کہا:

ورب هذه البنية لتردن على ابن اختنا ركحه او لاملئن منك السيف ، قال فاني ورب هذه البنية ارد ركحه . فاشهد عليه من حضر ، ثم قال المنزل يا ابن اختي . فاقام عنده ثلاثا واعتمر . (۳۰)

اس عمارت (خانہ کعبہ) کے رب کی قسم یا تو تم میرے بھانجے کا غصب شدہ صحن اسے واپس کرو گے یا میں اس تلوار کو تمہارے خون سے تر کر دوں گا۔ نوفل نے کہا: تو فیصلے کی بات یہ ہے اور اس عمارت کے رب کی قسم میں اس کو اس کا صحن واپس کر دوں گا۔ پھر ابو سعد بن عدی نجاری نے حاضرین کو اس پر گواہ بنایا اور

پھر کہا: اے بھانجے اب گھوڑے سے اترنے کا وقت آیا ہے۔ تین دن تک آپ کے پاس ٹھہرے اور اس اثناء میں عمرہ بھی ادا کیا۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قریش کے رؤساء پورے عالم عربی میں سب سے نمایاں مقام اور شرف و مرتبہ کے حامل ضرور تھے۔ مگر کبھی کبھار وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیا کرتے تھے۔ اس طرح سے غلط کاریوں میں ملوث ہو کر بدنامی کے داغ بھی لے لیتے تھے۔ حتیٰ کہ جہاں موقع ملتا ظلم و تعدی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ دوم یہ کہ قریش کے دیگر سردار بلند رتبہ لوگوں کے باہمی معاملات میں مداخلت سے گریز کیا کرتے تھے۔ سوم یہ کہ رؤسائے قریش اپنی مسلمہ اقدار کے منافی حرکات پر بیرونی سماجی دباؤ کے زیر عتاب بھی آیا کرتے تھے۔ البتہ ایسے دباؤ کو وہ پوری پوری اہمیت دیا کرتے تھے۔ چہارم یہ کہ اگر کبھی حدود سے تجاوز کر جاتے تو بیرونی سماجی دباؤ بھی ایک ایسا اہم عنصر تھا جو پھر سے ان کو راہ راست پہ لے آتا تھا۔ اور پنجم اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی غلط کاریوں اور ظلم و تعدی کو عین حق و انصاف ثابت کرنے پر بضد نہیں رہتے تھے۔

اس واقعہ سے اسی طرح ظلم و جور کے بارے میں بھی ان کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے کہ کس طرح سماجی دباؤ کے یہ ریلے واپس ان کو ان کی حدوں میں دھکیل دیتے تھے۔ اور حکم اعلیٰ کا عظیم القدر منصب اپنے پاس رکھنے کے باوجود حق و انصاف پر مبنی بیرونی فیصلوں کے آگے بھی سر تسلیم اور جبین نیاز خم کر دیا کرتے تھے۔

حاصل بحث

اس پوری بحث کا حاصل و نتیجہ یہ ہے کہ بت پرست عربوں کی نگاہ میں ہر والیٔ کعبہ ایک ایسا خدائی خانوادہ ہوتا تھا جو مذہبی و دینی پیشوائیت کے بے پناہ اختیارات کا حامل ہوتا تھا۔ سیاسی، اخلاقی اور روحانی قیادت اسی کے سپرد اور اسی کو زیبا تھی۔ بایں معنی والیان کعبہ کو وہ روئے زمین پر مقتدر ترین قوت مانتے تھے اور ان کو اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ کا درجہ دیتے تھے۔ اور یہ بھی ان کے اعتقاد کا اہم اور نا قابل فراموش جز تھا کہ وہ ان سے کسی قسم کی غلط کاری یا بے اعتدالی کی توقع بھی نہ رکھتے تھے۔ نہ ہی ان کے لئے مذہبی و سماجی نوعیت کے افعال شنیعہ اور حرکات قبیحہ کو روا جانتے تھے۔

خود قریش مکہ کو بھی اس بات کا پورا پورا احساس اور لحاظ تھا کہ خلق خدا کی نگاہ میں ان کا یہ مقام و منصب بلند کرداری، بالغ نظری، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے ذریعہ ذور سے ہی قائم ہے اور قائم رہ سکتا

ہے۔ محض فصیح البیان شعراء کی قصیدہ خوانیاں، مقررین و خطباء کی شعلہ بیانیاں یا اور کوئی پروپیگنڈا ہم اس مقام و مرتبہ کے قیام و بقاء کے لئے قطعاً سود مند اور کارآمد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اپنی عزت و عظمت کو داغدار ہونے سے بچانے کے لئے ان کو جگر خوں کرنا پڑتا تو بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

آج کے جدید دور میں جب انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت کسی بھی شہر اور قریہ کو ایک تماشا گاہ عالم بننے میں ذرا دیر نہیں لگتی ایسا ہے کہ لوگ شاخ نشیمن سے اترنے میں ذرا دیر نہیں کرتے۔ قیادت و سیادت کے اہم ترین مراکز بے وفائیوں، سودے بازیوں اور مسلمہ و محترم قومی اقدار کی پامالیوں کی آماجگاہ کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ اس کے مقابل یہ عالی ظرفی، بالغ نظری اور بلند کرداری ہمیں ان لوگوں کے ہاں ملتی اور نظر آتی ہے جن کو ہم عہد جاہلی کا پروردہ کہتے نہیں تھکتے۔

حضور سرور دو عالم ﷺ کی بعثت مبارکہ سے تقریباً ایک سو تیس برس قبل ولایت کعبہ سے عبارت یہ عزت و عظمت سمٹ سمٹا کر پھر سے خاندان قریش کے پاس آگئی تھی۔ اور گزرتے وقتوں کے ساتھ اسی قبیلے کے مختلف خاندانوں میں منقسم ہو کر بعثت مبارکہ تک محفوظ رہی ہے۔ لہٰذا قریش مکہ اس بات کے پوری طرح سے اہل اور اس لائق تھے کہ آخری بعثت انہی میں سے ہو۔ اور رہتی دنیا تک پورے عالم ارضی کی قیادت و سیادت انہی کو سونپی جائے۔ یہی چیز ایک عظیم تر عالمی، علمی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی انقلاب کی قیادت و سیادت کے لئے عالم میں ان کے انتخاب کی وجہ نظر آتی ہے۔

مآخذ و مراجع

۱۔ جرجی زیدان تاریخ تمدن اسلام، مترجمہ حلیم انصاری ردولوی، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۳ء، ص:۴۵

۲۔ زہیر بن ابی سلمیٰ مری، ربیعہ بن رباح، دیوان زہیر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۳، ص:۸۵و۸۶

۳۔ کلام مقدس، تکوین، باب:۲۵، فقرہ:۱۷

۴۔ ایضاً، تکوین، باب:۲۵، فقرات ۱۳ تا ۱۶

۵۔ مسعودی علی بن الحسین، مروج الذہب، بیروت، دار الکتب العلمیہ، سن درج نہیں، ص:۵۳، ج:۲

۶۔ ابن ہشام، عبد الملک، السیرۃ النبویۃ علی ہامش ''الروض الانف'' للسہیلی، ملتان، عبد التواب اکیڈمی، بلا سن طباعت، ص:۸۰، ج:۱

۷۔ ایضاً، ص:۸۱، ج:۱

۸۔ ایضاً، ص:۸۳، ج:۱

۹۔ حموی یاقوت بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، معجم البلدان، بیروت، دار الکتاب العربی، ص:۱۸۶، ج:۵، مادہ: مکہ

۱۰. مبارکپوری صفی الرحمن، الرحیق المختوم، لاہور، المکتبۃ السلفیہ، اپریل ۱۹۹۹ء، ص:۴۹

۱۱. حموی یاقوت بن عبداللہ، ابوعبداللہ، معجم البلدان، محولہ بالا، ص:۱۸۶، ج:۵، مادہ: مکہ

۱۲. مسعودی علی بن الحسین بن علی، ابوالحسن، مروج الذہب ومعادن الجوہر، محولہ بالا، ص: ۶۳، ج:۲

۱۳. ابن ہشام، عبدالملک، ابومحمد، المعافری، السیرۃ النبویۃ، محولہ بالا، ص:۸۷، ج:۱

۱۴. طبری محمد بن جریر، ابوجعفر، تاریخ الطبری، مصر، دارالمعارف، ۱۹۶۹ء، ص:۲۵۸، ج:۲

۱۵. شداخ کا لفظی معنی ہے: سر توڑنے یا کچلنے والا

۱۶. منصورپوری محمد سلیمان سلمان، قاضی، رحمۃ للعالمین، کراچی، دارالاشاعت، ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ، ص:۴۹، ج:۲

۱۷۔ زہیر بن ابی سلمیٰ مری، ربیعہ بن رباح، دیوان زہیر، محولہ بالا، ص:۸۷

۱۸. مسعودی علی بن الحسین بن علی، ابوالحسن، مروج الذہب ومعادن الجوہر، محولہ بالا، ص:۶۵، ج:۲

۱۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، محولہ بالا، ص: ۹۰، ج:۱

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ قمیسی محمد حسن الشیخ، مازال التاریخ، بیروت، دارالمعارف للمطبوعات، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۲۳، ج:۱

۲۳۔ زہیر ابن ابی سلمیٰ مری، دیوان زہیر، محولہ بالا، ص: ۸۵

۲۴۔ قرآن حکیم، سورۃ المائدہ، آیت: ۵۰

۲۵۔ حموی، یاقوت بن عبداللہ، ابوعبداللہ، معجم البلدان، مادہ مکہ

۲۶۔ ابن اثیر، علی بن ابی الکرم، ابوالحسن، الکامل فی التاریخ، محولہ بالا، ص: ۲۱، ج:۲

۲۷۔ طبری، محمد بن جریر، ابوجعفر، تاریخ الطبری، محولہ بالا، ص: ۲۵۹، ج:۲

۲۸. ایضاً، ص: ۱۱، ج:۲ (خلاصہ)

۲۹۔ طبری، محمد بن جریر، ابوجعفر، تاریخ الطبری، محولہ بالا، ص: ۲۲۸، ج:۲

۳۰۔ ایضاً، ص: ۲۲۹، ج:۲

ہجری کیلنڈر، شعار اسلام کا اہم جزء

محمد عبدالرحمٰن صدیقی، ٹوکیو (جاپان)

پہلے چند مخففات کی تشریح

A.D کا مطلب ہے Anno Domini۔ یہ لاطینی لفظ ہے اسکا انگریزی ترجمہ ہے In the year of the lord۔ AC کے معنی ہے After christ۔ CE مخفف ہے Christion Era کا۔

اردو میں حرف ء۔ اشارہ ہوتا ہے رسول اکرم ﷺ کی ہجرت مدینہ کی طرف اور انگریزی میں A.H کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ ہاں اردو میں سال کے عدد کے بعد چھوٹا سا حرف ع۔ ء لکھنے کا مطلب ہوتا ہے سال یا سنہ عیسوی جو مجموعہ ہے A.D۔AC اور CE کا۔ یہ تمام حروف اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش یا ان عیسائیوں کے مطابق انکی علیہ السلام مصلوبیت کو اتنے سال گذر گئے۔ اس طرح جب بھی یہ مخففات لکھے جاتے ہیں عقیدۂ ''مصلوبیت مسیح'' کو تازہ کرلیا جاتا ہے اس طرح ایک مخفف میں بھی ایک عقیدہ مخفی ہے۔ اس طرح ہر بار جب ہم عیسائی سال جسے (Western) مغربی کہہ دیا جاتا ہے لکھتے ہیں تو ہم بغیر ارادہ کے بھی ایک خاص غیر اسلامی عقیدہ کی تحریری تصدیق کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک نادانستہ غلطی ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے جب کسی سال کے عدد کے بعد ہم ھ یا A.H لکھتے ہیں تو ہم ایک عظیم الشان تاریخی واقعہ اسلامی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ سیرت طیبہ ﷺ کا ایک اہم واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے پیغام رسالت وہدایت کو عام کرنے کی خاطر گھربار اور بیت اللہ غرض سب کو چھوڑ کر دوسرے شہر یعنی مدینہ منورہ کو مسکن دائمی بنایا۔ اس ہجرت کے دن کو اسلام کے شیدائیوں نے نئے سال کی ابتدا کا دن بنادیا۔ مثلاً ۱۴۲۸ھ کا ہجری سال جنوری بیس (۲۰) ۲۰۰۷ء کو شروع ہوا تھا۔ اور اب ۱۴۲۹ھ کا نیا سال دس (۱۰) جنوری ۲۰۰۸ء کو شروع ہوا یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اس طرح عموماً ہر سال گیارہ (۱۱) دن کا فرق ہوتا جاتا ہے۔

ہجری سال قمری حساب سے یعنی نئے چاند کے نظر آنے سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی اگر آج

شام کو چاند نیا نظر آیا یا نظر آنا مان لیا گیا تو کل نئے ہجری ماہ (یا قمری مہینہ) کی یکم ہوگی۔ یہ باب قابل غور ہے کہ ہجری (اسلامی) سال کی ابتدا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش، نکاح، ابتداء نزول قرآن آپ ﷺ کی وفات طیبہ جیسے کسی بھی دوسرے اہم واقعہ سے نہیں ہے بلکہ دعوت حق کی خاطر قربانی کے واقعہ ہجرت سے ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں مقصد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ویسے تو ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا، ترک کرنا۔ یہ عربی لفظ ہے یہ چھوڑنا یا ترک کرنا دل سے ہو یا زبان وعمل سے ہو۔ لفظ ہجرت سب پر حاوی ہے۔ اسی سے لفظ مہاجر نکلا ہے۔ وہ شخص جو کسی شخص، نظریہ، عمل، مقام یا نام کو ترک کر دے اور کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ مگر اصطلاحاً مہاجر وہ شخص ہے جس نے باذن رسول ﷺ اپنا وطن اور خاص طور پر مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم موقوف کر دیا گیا۔ اب ہجرت کا معنی صرف یہ ہے کہ اگر ارکان دین اور واجبات شرعیہ کو ادا کرنے سے مجبور کر دیا جائے اور اس دشمن اسلام مقام سے کوئی مسلمان صرف اسلام کی خاطر دوسری جگہ منتقل ہو جائے جہاں اسکا دین ایمان خطرہ سے باہر ہو۔ اصلی ہجرت تو یہ ہے کہ مسلماں غیر اسلامی امور، بداخلاقی، گناہوں غیر اسلامی رسوم و رواج کو اللہ کی رضا کے لئے چھوڑ دے۔ متفق علیہ حدیث نبوی ﷺ سب کو معلوم ہے جس میں اعمال کے درست و مخلص ہونے کا دار و مدار نیتوں پر بتایا گیا ہے۔ (تفصیل کتب حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے)۔ اور یہ حدیث ہجرت کے مفہوم کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔ ایک اور جگہ ہجرت کی فضیلت میں آیا ہے کہ دین و ایمان کی حفاظت کے لئے خواہ ایک (شبر) بالشت ہی کیوں نہ ہو اگر ایک ارض، ملک، علاقہ یا مقام سے نکل کر دوسری جگہ کوئی چلا جائے تو اسکے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

ہجرت کے بارے میں قرآن کریم کی متعدد آیات ہیں سورۃ العنکبوت آیت ۵۶ کا مفہوم ہے کہ بندے اللہ کی اطاعت کے لئے ہجرت کر جائیں۔ اب یہ ہجرت ذہنی، جسمانی، مکانی یا اعمالی کوئی بھی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ ہم نے دین اسلام میں ہجرت کے فلسفہ پر اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ اس کی اہمیت واضح ہو جائے اور آگے جب ہجرت نبوی ﷺ پر مبنی کیلنڈر یا تقویم کی بات سامنے آئے تو اسکی اہمیت اور مقصدیت کا ادراک آسان ہو۔ اور ہجری کیلنڈر کا پس منظر نظر میں رہے۔

۶۳۸ء عیسوی سال میں حضرت عمرؓ خلیفہ راشد دوئم نے محسوس فرمایا کہ کاروبار خلافت کی انجام دہی میں تاریخ کا تعین ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک عملی ضرورت تھی۔ وسعت پاتی ہوئی

اسلامی سلطنت میں فوجی، انتظامی امور اور دوسرے حکمرانوں سے معاملات و معاہدات طے کرتے وقت دن تاریخ مدت کا تعین ضروری تھا۔ لیکن اس وقت کے ایران میں جو ایک نیا مفتوحہ علاقہ تھا۔ اور اسی طرح مصر میں انکے اپنے اپنے تاریخوں کے طریقے جاری تھے۔ ایران والے ساسانی حکمران یزدگرد سوئم کی تخت نشینی سے ماہ و سال شمار کرتے تھے۔ سیریا (شام) جو اس وقت تک بازنطانی سلطنت کا حصہ تھا اور اب اسلامی سلطنت کا حصہ تھا۔ وہاں رومن جولین (Roman gulian) کیلنڈر اور مصر میں قبطی کیلنڈر چل رہا تھا۔ اگرچہ یہ تمام کیلنڈر ۳۶۵ دن کے تھے واضح ہو کہ شمسی حساب سے ایک سال ۳۶۵_۲۴۲۲ دنوں کا ہوتا ہے۔ دور اسلامی سے قبل عرب میں ماہ و سال کو شمار کرنے کا انکا اپنا الگ طریقہ تھا۔ جنوبی علاقہ میں سال اس طرح شمار ہوتا کہ موسم سے مطابقت کے لئے شمسی قمری حساب کو گڈمڈ کر کے کچھ دن آگے پیچھے کر لیا جاتا تا کہ موسم سے مطابقت ہو جائے۔ وہ اپنے تہواروں کے لئے آسانی پیدا کر لیتے۔ کچھ یہی حال تھا وسطی عرب کا بھی۔ وہ لوگ چاند کے کل وقوع سے بھی مدد لیتے تھے۔ انکے یہاں سالوں کے نام بھی واقعات پر رکھے جاتے مثلاً عام الفیل ہاتھی والا سال۔ حلف الفضول کا سال وغیرہ۔

یہاں یہ معلومات شاید باعث دلچسپی ہوں گی کہ ۱۹۲۳ء میں اقوام متحدہ جو اس وقت League of nations تھی۔ اس نے ایک خصوصی کمیٹی مقرر کی تھی اور اسے کام دیا گیا کہ تمام دنیا کے لئے قابل قبول کیلنڈر مقرر کیا جائے۔ اس میں ۱۳ (تیرہ) ماہ رکھے جانے کی تجویز تھی۔ مگر آب و ہوا کے معاملہ پر اختلاف کے باعث یہ کیلنڈر نافذ نہ ہو سکا۔ قمری کیلنڈر جسے ہجری کیلنڈر کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ وہ درج بالا عیوب سے پاک ہے۔ اسکا موسمی تغیرات سے کوئی تعلق نہیں۔ ۱۲ بار چاند کا نکلنا (نظر آنا) اور بارہ (۱۲) بار ہی غروب ہونا ساری دنیا میں معلوم کیا جاسکتا ہے اور اکثر و بیشتر دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ چاند کرہ ارض کے گرد 364.48/34 دنوں میں اپنا سفر پورا کرتا ہے۔ اس مدت میں کبھی بھی کہیں بھی ۱۳ بار نکلتا ہے نہ ۱۳ بار غروب ہوتا ہے۔

یہاں پر حکیم محمد سعید مرحوم شہید کا ایک مقالہ یاد آیا۔ انہوں نے Val iv No:3,1981 Hamdard Islamicus میں لکھا عنوان تھا "The History of Islamic Calendar in the light of Hijrat" اس مقالہ میں فاضل دانشور نے ایک واقعہ لکھا ہے جسے امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ نے میمون ابن مہران کی جانب سے لکھے ہوئے ایک I.O.U۔ مقروض نامہ کا حوالہ دیا ہے جو ماہ شعبان میں قابل ادائی تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ

کس شعبان میں قابل ادائی ہے۔ موجودہ شعبان یا آئندہ والے۔ پھر فرمایا کہ بات اور تحریر ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔

F.Rosenthal,A History of Muslim (Historology.Leidin.1952.P310.

یہ بات تو برسبیل تذکرہ آگئی۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ آپؐ نے تعیین تاریخ کیلئے ایک ضابطہ کی اور باقاعدہ کیلنڈر کی ضرورت محسوس کرلی ہوگی۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ہجری کیلنڈر جاری فرمایا یہ ۱۹ ہجری کا واقعہ ہے۔ یعنی رسول اکرم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے سولھویں سال اسلامی ہجری کیلنڈر کا اجراء عمل میں آیا۔ السیوطی کے "اخبار واحکامات" "تاریخ الخلفاء (قاہرہ ۱۳۵۱ھ) میں المسیب کے حوالہ سے تحریر کیا گیا ہے کہ اس حکم کے بعد سے حضرت عمرؓ خلیفہ راشد (دوئم) نے تمام دستاویز پر حضرت علیؓ (خلیفہ راشد چہارم) کے مشورہ سے تاریخیں درج کروائیں۔ واضح رہے کہ ہجرت نبوی ﷺ کے دسویں سال حج الوداع کے موقع پر ہی رسول اکرم ﷺ نے ایام جاہلیت کی تمام رسوم کے ساتھ فصیح وبلیغ خطبہ میں ایام جاہلیت کے کیلنڈر کو بھی مسترد فرمادیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ہجری کیلنڈر جاری کرنا اور اسے قمری حساب پر مبنی کرنا تعلیم قرآنی کے عین مطابق بھی ہے۔ فرمان رب العالمین سورہ یونس ۱۰ آیت نمبر ۵ کا مفہوم یوں ہے "وہی ہے جس نے سورج کو چمک والا بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرسکو......" تفسیر احسن الکلام۔ دار السلام۔ ڈاکٹر محمد محسن خان۔ اور آگے دیکھئے۔ قرآن کریم واضح طور پر کیلنڈر کا نظم بتارہا ہے مفہوم ہے "بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہی ہے...... ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں..... حوالہ۔ سورۃ التوبہ ۹۔ آیت نمبر ۳۶۔

حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق (جو تعلیم قرآن پر مبنی تھا) طے ہوا کہ اسلامی کیلنڈر ہجرت سے شروع ہوگا۔ اسمیں ۱۲ مہینے ہونگے۔ مہینوں کے ابتدا پیدائش قمر۔ یا ظہور قمر سے ہوگی۔ اور پھر یہ اسلامی ہجری کا سال ۳۵۴ دن کا ہوگا۔ جو عام زیر استعمال ۲۰۰۸.....۲۰۰۹ والے کیلنڈر سے ۱۱ دن کم ہوگا۔ ابتدائے کیلنڈر کو ہجرت کے واقعہ سے منسلک ہونے میں یہ بھی ایک پنہاں اشارہ ہے کہ اسی دن سے مسلمان ایک بااختیار حکومت قائم کرسکے تھے اور انہیں سیاسی۔ مالی اور دستوری آزادی حاصل ہوئی تھی۔ اور شریعت محمدی ﷺ کے نفاذ کا وقت آچکا تھا۔ غرضیکہ رسول اللہ ﷺ نے یکم محرم کو مدینہ میں قدم رنجہ

فرمایا۔ آج کی اصطلاحات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو حقوق انسانی Human Right ملنے کی ابتدا ہورہی تھی۔ Terrorism دہشت گردی کے شکار مسلمان امت کو ایک سہارا مل گیا۔ جہاں وہ شریعت اسلامی کو نافذ کرسکتے ہیں۔ الغرض ابتدائے ہجری کیلنڈر پہلی سلطنت الٰہیہ کے قیام کی یاد دلاتا ہے۔ اور یکم محرم اسلامی ہجرہ کیلنڈر کا پہلا دن ہوا۔

چونکہ اسلام کا ہجری کیلنڈر سورج کے بجائے چاند سے تعلق رکھتا ہے اور شمسی کیلنڈر سے ۱۱ دن کم ہوتا ہے۔ اس لئے یہ موسم یا آب وہوا کے تحت نہیں اور نہ گرمی سردی کے موسموں سے مطابقت رکھتا ہے۔ یعنی کسی علاقہ میں جون، جولائی، اور اگست ہمیشہ گرمی کا موسم ہوگا اور نومبر دسمبر جنوری ہمیشہ ہی سردی کا موسم ہوسکتا ہے مگر قمری حساب میں ہر سال ۱۱ دن کا فرق ہوتا جائیگا۔ یعنی ہر سال موسم گرما اور موسم سرما ۱۱ دن جلد آجائیگا۔ اسطرح رمضان جو گرمی میں آرہا ہے آہستہ آہستہ سردی کے ایام میں آجائے گا۔ یہ بھی اللہ کا کرم اور اسکی رحمت ہے کہ رمضان کے روزے، حج کے ایام مختلف موسموں میں آتے رہیں گے۔ ایسا نہ ہوتا تو کسی علاقہ میں رمضان ہمیشہ ہی گرمی یعنی مثلاً مئی جون جولائی میں ہی واقع ہوتا جو یقیناً تکلیف دہ ہوسکتا تھا۔ حساب کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر ۳۳ شمسی سالوں میں قمری سال کی ابتدا بالکل تبدیل ہوجاتی ہے۔ بہرحال یہ ۱۱ دن والا فرق جس کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ بے خاص سبب دشواری جس کی وجہ سے شمسی اور قمری تاریخوں کا حساب نسبتاً مشکل ہوجاتا ہے۔ دراصل یہ دو الگ الگ سسٹم ہیں۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قمری ہجری کیلنڈر میں حقیقی قمری Phase (دور) یا طلوع ہلال استعمال ہوتا ہے جبکہ شمسی مغربی۔ (Western) میں اسے ۱۲ مہینوں کے ہونے کے باوجود سورج کے ساتھ مطابقت کردی جاتی ہے۔ عیسوی عقیدہ کا یہ کیلنڈر مختلف اضافوں اور ترمیم وتنسیخ کے بعد بروز جمعہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۵۸۲ عیسائی دنیا میں نافذ کردیا گیا۔ اور اسے Pape Gregory XIII کے نام سے Gregorcan Calendar کے نام سے مشہور کیا گیا اور آج اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے برطانیہ اور امریکہ میں ۱۸ ویں صدی میں قبول عام حاصل ہوا جسکے بعد یہ ساری دنیا (بہ شمول اسلامی دنیا) میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس عیسائی C.E.-A.D. کیلنڈر کی ایک جھلک۔

اب یہ الگ افسوسناک صورت حال ہے کہ اکثریت مسلم آبادی کے ممالک بھی "جناب" Pape Gregory والا کیلنڈر ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اپنی مرضی کے انتخاب سے نہیں بلکہ جبراً ہے اور صاف کہوں تو یہ غیر ملکی نوآبادی کا جبری تحفہ ہے۔ مان نہ مان میں تیرا

مہمان۔ جس طرح دیگر علامات (شعار) اسلام صرف کتابوں اور عقیدہ میں زندہ ہیں اور عملاً کم نظر آتے ہیں اسی طرح تقویم ہجری یا ہجری کیلنڈر کا حال ہے۔

تقویم ہجری شعار اسلام میں ہے: حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جو کتاب ہدایت دی ہے اسمیں تمام اہل اسلام کو دن، ماہ اور سال کی باتیں بتادی گئی ہیں۔ اور اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ رحیم و کریم نے اپنی کتاب برحق میں بار بار دن، مہینہ اور سال عربی الفاظ میں استعمال کئے ہیں اور المعجم المفہرس لالفاظ القرآن بحاشیہ المصحف الشریف وضعہ محمد فؤاد عبدالباقی، توزیع دار الحدیث، القاہرہ، مصر دیکھنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ قارئین تحریر کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے کچھ معلومات درج کی جاتی ہیں:

لفظ (دن کیلئے) قرآن کریم میں کتنی بار آیا (تقریبا) الیوم: ۳۴۹، یوماً: ۱۶، یومکم: ۵، یومہم: ۵، یومین: ۳، ایام: ۲۳، ایاماً: ۳، یومئذ ۶۸، یومئذٍ: ۳، مجموعہ ۴۷۵۔ لفظ (ماہ کیلئے) قرآن کریم میں کتنی بار آیا (تقریبا) الشہر: ۱۰، اشہر: ۲، شہرین: ۲، الشہور: ۱، اشہر: ۶، مجموعہ: ۲۱۔ لفظ (سال کیلئے) قرآن کریم میں کتنی بار آیا (تقریبا) سنۃ: ۸، سنین: ۱۲، مجموعہ: ۲۰

اس تفصیل کو سامنے لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کلام اللہ میں دن، مہینہ، سال کا تذکرہ کسی حکمت کے تحت ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا کوئی لفظ کوئی حرف یا کوئی زیر و زبر نعوذ باللہ مقصدیت یا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ ایام، ماہ و سال کو قمر سے جوڑ دیا گیا ہے۔ سبحان اللہ اس طرح خالق کائنات رب العزت نے اپنے بندوں کو گویا اشارہ دے دیا ہے کہ قمری حساب والے کیلنڈر کے ذریعہ ہی دن تاریخ ماہ و سال کا تعین کریں۔ (نوٹ: یہ اشارہ یا رضاء الٰہی حکم کے درجہ میں ہے یا نہیں اسپر علماء قرآن و حدیث و مفسرین کرام ہی رائے دے سکتے ہیں۔)

غنیمت ہے کہ مسلم ممالک میں مغربی۔ مسیحی گریگوری پوپ صاحب کے جاری کردہ کیلنڈر کی حکمرانی کے باوجود ابھی تک مسلمان رمضان۔ عید الفطر۔ عید الاضحیٰ وغیرہ قمری حساب سے ہی مقرر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ساری دنیا کا مسلمان بحیثیت مجموعی پریشان رہتا ہے کہ سارے کرۂ ارض پر ایک ہی دن ابتداء رمضان ہو اور عیدین بھی سب جگہ ایک ہی دن ہو۔ مگر عملاً یہ ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جب ایک جگہ دن ہوتا ہے تو دوسری جگہ رات اور ساری دنیا میں ایک ہی دن ایک ہی وقت نہ سورج نکلتا ہے نہ چاند مطلع پر پیدا یا ظاہر ہوتا ہے۔ اس تعین ابتداء رمضان وغیرہ پر شدید اصرار سے سوائے خلجان اور فساد کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی یہ کوئی کفر و ایمان کا مسئلہ نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ جس دن مکہ

، قاہرہ، کراچی اور انڈونیشیا میں یکم رمضان یا یوم عید ہو وہی ساری دنیا میں بھی ہو۔ یہ جغرافیائی ناممکنات میں سے ہے۔ کیونکہ ان میں کہیں ۶ گھنٹوں کہیں ۱۰ اور کہیں ۱۲ گھنٹوں کا فرق ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ملک سے دور دراز کے دوسرے ملک والوں کو E میل Fax یا فون سے بتائے کہ ہمارے یہاں آج یکم رمضان ہے۔ یکم شوال یا ۱۰ ذوی الحجہ ہے تو لازم نہیں کہ دوسرے ملک میں بھی وہی دن تاریخ ہو۔ اس لئے ایک ہی دن ساری دنیا میں رمضان، عید، بقر عید کی خواہش تو کی جاسکتی ہے مگر عملاً ناممکن ہے ہاں اگر قمری کیلنڈر کو خیر باد کہنا ہے تو اور بات ہے۔ لہذا مصلحت امت اس بات میں ہے کہ اختلاف مطالع اور اختلاف رویت ہلال کو بہ خوشی قبول کیا جائے۔ نہ دین سے جھگڑا کیا جائے نہ باہمی نزاع بڑھائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں ہم لوگ اس مسئلہ پر ہر سال کچھ دنوں کے لئے غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔ ذہنی نفسیاتی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور چاند کو وجہ نزاع بنالیا جاتا ہے۔ اور ہر سال اتحاد امت میں رخنہ پڑ جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا ان کا فرض ہے جن کے پاس قوت نافذہ ہے۔

ہجری کیلنڈر کیوں اور کیسے؟

درج بالا معروضات سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ ہجری کیلنڈر کیا ہے۔ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اور ہم جو پوپ گریگوری کا جاری کردہ کیلنڈر استعمال کرتے ہیں اسکی اصلیت کیا ہے۔ اب ہجری کیلنڈر کے نفاذ و اجراء پر گفتگو کرتے ہیں۔

دیکھئے، کوئی بھی چیز اگر استعمال نہ کی جائے تو بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ اسلامی تعلیمات تو دائمی ہیں مگر ہم اسے استعمال نہ کریں یا نافذ نہ کریں تو ہم خود اسکی افادیت سے محروم ہو جائینگے۔ اس میں شک نہیں کہ ہجری کیلنڈر کو یک بیک نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے تیاری کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے تو عوام تاجر طبقے اور حکومت کے اداروں کو ذہنی طور پر تیار اور آمادہ کرنا ہوگا۔ اسکے بعد اسکی تشہیر، طباعت اور بتدریج استعمال میں لانا ہوگا۔ اور ساتھ ہی امت کو اس ہجری کیلنڈر کے اسلام سے تعلق کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔ یہ ہرگز کسی سے تعصب یا نفرت کا معاملہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے محبت رسول ﷺ کا معاملہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی روایات کو زندہ کرنے میں ہجری کیلنڈر سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک طرح امت کا امتحان بھی ہے کہ اپنی شناخت اپنی پہچان اپنی روایات کا کتنا پاس ہے۔ جو قومیں اپنی Identity شناخت کھو دیتی ہیں انکا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ قومیں اپنی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ صرف کیلنڈر ہی علامت شناخت نہیں مگر یہ بھی شناخت والی چیزوں میں سے

ایک ہے۔ آیت: ان الصفاو المروہ من شعائر اللہ میں لفظ من یہ آواز دے رہا ہے کہ صفا مروہ تو شعائر اللہ ہیں مگر دوسرے اور بھی شعائر ہیں۔ آیئے اس سلسلہ میں کچھ مزید مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ لغات القرآن مع فہرست الفاظ۔ مولانا محمد عبد الرشید نعمانی دار الاشاعت۔ اردو بازار کراچی۔ جلد ۳-۴ کے صفحہ نمبر ۲۷۷-۲۷۶ پر نہایت مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''سورۂ مائدہ میں ہے۔ آیت لاتحلوا شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ شعائر اللہ، اللہ کے دین کے تمام نشانات پر حاوی ہے یعنی دین کے وہ فرائض اور نشانات کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور انکے حقوق میں کوتاہی نہ ہو اور انہیں ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ معنی تمام معانی کو جامع ہے کہ جو سلف سے اس کی تشریح میں مروی ہیں۔''

۲۔ ''شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی ایک مقام پر فرماتے ہیں (اصل عبارت فارسی میں ہے) طوالت کے خیال سے خلاصہ اردو میں درج ذیل ہے'' اس لفظ کا اطلاق مکانات، مقامات، زمانہ، علامات اوقات .....اور اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا تعلق کسی مکان، زمان عبادت سے ہو یا وہ خود عبادت ہو اور اس سے معبود کی یاد دلائیں'' بلکہ آخری فارسی الفاظ ہیں'' بلکہ از معبود یاد میدھد'' حوالہ تفسیر فتح العزیز ص ۳۶۹۔ طبع مجتبائی دہلی۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ البالغہ میں ایک مستقل باب باندھا ہے۔ باب ''تعظیم شعائر اللہ'' شعائر اللہ کی مزید تشریح و تفصیل سمجھنے کے لئے اہل علم کو اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اب اختتام مضمون میں ہم لفظ شعار، شعائر پر تحقیق کے لئے چند مترجمین و مفسرین کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ امت کے صاحبان علم کو یہ محسوس ہو جائے کہ کیلنڈر ہجری کا تعلق صرف تاریخ اور دن معلوم کرنے سے نہیں بلکہ یہ اتحاد امت کا ایک ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ تمام دنیا کے لئے ایک ہی قمری ہجری کیلنڈر نہیں بن سکتا۔ مگر ایک بڑے خطہ ارض یعنی کئی ممالک کے لئے یا ایک منطقہ کے لئے ایک کیلنڈر بنایا جا سکتا ہے۔

تحقیق مزید: شعائر۔ شعار کی جمع ہے نہ کہ صرف یہی شعائر ہیں۔ یہ لفظ کلام اللہ میں چار (۴) بار استعمال ہوا ہے:

۱۔ سورہ نمبر ۲۔ البقرہ آیت ۱۵۸۔ ان الصفاو المروہ من شعائر اللہ .....

میں یہاں لفظ ''من'' پر توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ یعنی صفا مروہ دوسرے شعائر میں سے مطلب یہ کہ دوسرے بھی کئی شعائر ہیں۔

۲۔ سورہ نمبر ۵۔ المائدہ، آیت ۲۔ یاایھا اللذین آمنو لاتحلو شعائر اللہ .....

۳۔ سورہ نمبر ۲۲۔ الحج، آیت ۳۲۔ وذالک من یعظم شعائر اللہ ....

۴۔ سورہ نمبر ۲۲۔ الحج، آیت ۳۶۔ والبدن جعلنا ھالکم من شعائر اللہ .....

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی العموم یہ آیات حج اور اسکے مناسک، صفا مروہ، بیت اللہ، قربانی کے جانور وغیرہ سے متعلق ہیں۔ مگر میں یہاں خاص طور پر سورہ نمبر ۲۲ الحج کی آیت ۳۲ پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس آیت مبارکہ کے یوں تو کئی تراجم ہیں۔ مگر چند ایک پیش کئے جاتے ہیں اور اسکے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ تقویم ہجری کو شعائر اسلام سے کس قدر تعلق ہے۔ (سورہ نمبر ۲۲۔ الحج، آیت ۳۲۔)

۱۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ: ''یہ سن چکے اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا، سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے'' اسکی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں: ''یعنی شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں۔ جس کے دل میں پرہیزگاری کا مضمون اور خدائے واحد کا ڈر ہوگا وہ اس کے نام لگی چیزوں کا ادب ضرور کریگا'' اب یہ بات ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ دن، ماہ و سال کا اللہ تعالیٰ کے احکامات سے گہرا تعلق ہے۔

۲۔ مولانا فتح محمد جالندھریؒ: ''یہ ہمارا حکم ہے، اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے۔ تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے''

۳۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (ادارہ ترجمان القرآن لاہور): ''یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقوٰی سے ہے'' وضاحت میں لکھتے ہیں یعنی یہ احترام دل کے تقوٰی کا نتیجہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ نہ کچھ خدا کا خوف ہے جبھی تو وہ اسکے شعائر کا احترام کر رہا ہے۔

۴۔ مولانا محمد جونا گڑھی (مطبوعہ، ملک فہد بن عبد العزیز آل سعود): ''یہ سن لیا اب اور سنو اللہ کی نشانیوں کی جو عزت و حرمت کرے اس کے دل کی پرہیزگاری کی وجہ سے یہ ہے۔ وضاحت میں فرماتے ہیں..... اس اعتبار سے شعائر اللہ وہ ہیں، جو اعلام دین یعنی اسلام کے نمایاں امتیازی احکام ہیں، جن

سے ایک مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے اور دوسرے اہل مذاہب سے الگ پہچان لیا جاتا ہے
.....اس تعظیم کو دل کا تقویٰ قرار دیا گیا ہے"

۵۔ زبدۃ التفسیر من فتح القدیر۔ محمد سلیمان عبداللہ الاشقر۔ وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ۔ دولۃ الکویت۔ میں اس آیت کی وضاحت یوں ہے:

اعلام دینہ، ویدخل الھدی فی الحج ومناسک الحج ومشاعرہ کلھا فی ذلک۔ وتدخل المساجد والعبادات ایضا......

۶۔ صفوۃ البیان لمعانی القرآن۔ لفضیلۃ الاستاذ الشیخ حسنین محمد مخلوف۔ وزارۃ اوقاف والشؤن الاسلامیہ۔ الکویت

"جمع شعیرۃ۔ وھی کل شی، للہ تعالیٰ فیہ امر اشعر بہ واعلم وشعائر اللہ: اعلام دینہ فی الحج۔ اوالاعمال التی امر بھا فیہ عندھذہ والاعلام (اور اعمال کا تعلق تقویم سے گہرا ہے)

7. The Holy Quran,Text,Translation and Comentary

A.Yuasf Ali writes as under:

"SHAIR;symbal,Signs marks by which something is Known to belong to some particular body of men"

8. Marmaduko Pekthall.

"That (is the eamand).And who so magnfieth the offering conseerated to Allah it Aurely is from devotion of the hearts"

اس کے علاوہ بھی بہت سی تفاسیر اور تشریحات ہیں اور ان سب میں ہی یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ ہر وہ چیز جسکا تعلق اللہ رب العزت سے ہوجائے اسکا ادب واحترام قلبی تقویٰ محبت، خوف رب العالمین کی نشانی اور علامت ہے۔ اور اسی ادب واحترام سے پرہیزگاری اور خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہیں۔ جو مغز وروح عبادت ہے۔

اب یہ کوئی ادق فلسفہ کی بات نہیں بلکہ صاف بات ہے کہ قرآن میں سال ماہ وایام (کیلنڈر میں یہی تو ہوتے ہیں) کے تذکرے کا تعلق خالق کائنات سے اتنا قریبی ہے کہ اسی کے تحت تمام فرائض خصوصاً رمضان وحج ادا کرنے کا حکم ہے۔ رمضان کے مہینے کے بجائے کسی اور مہینہ میں تیس ۳۰ روزے رکھ لینے سے روزہ کا فرض ادا نہیں

ہوگا۔ نہ ہی ذوالحجہ کے بجائے کسی اور مہینہ میں حج قبول ہوگا۔ اب اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہوگا کہ ہجری کیلنڈر شعار اسلام میں شامل ہے اور اسکا ادب، احترام اور استعمال اسلام کی وقعت وعزت کے مترادف ہے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو اہل علم وعلماء دین وضاحت فرمائیں کہ حقیقت کیا ہے۔ آخر تقویم ہجری کو شعائر اسلام کی فہرست سے کیوں خارج کیا جائے۔ اگر یہ اتحاد امت کا ذریعہ بنتا ہے تو اسے کیوں نہ استعمال کیا جائے اور رواج دیا جائے۔ مگر اسے جاری کر نا خوبصورت کاغذ، اچھے دیدہ زیب ڈیزائن اور رنگین طباعت میں تیار کرکے تقسیم کرنا شرط ہے۔

اسلامی شعائر: اسلام میں بعض اشیاء کو واضح طور پر شعار بتایا گیا ہے مثلاً صفا مروہ۔ بحوالہ قرآن کریم قربانی کے جانور......بحوالہ حدیث: "امرنی جبریل برفع الصوف فی الاھلال فانہ من شعائر الحج، مسند احمد تلبیہ کو زور کی آواز سے پڑھنا۔ مسند احمد

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن جلد اول سورہ المائدہ کی آیت ۲: کی وضاحت میں لکھتے ہیں "ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرز فکر وعمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا "شعار" کہلائے گی کیونکہ وہ اسکے لئے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔" کسی حکومت کے سکے، اسٹامپ سرکاری جھنڈے اور یونیفارم یہ سب حکومت کا شعار ہیں۔

یہ کوئی فتویٰ تو نہیں مگر مقام ابراہیم۔ حجر اسود ہلال (چاند) گنبد خضریٰ، بیت اللہ شریف ان سب کو بھی شعائر اسلامی میں شامل کرلیں تو کیا حرج ہے۔ بلکہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ خواتین اسلام کا حجاب اور مردوں کی داڑھیاں بھی ہماری شناخت ہیں انھیں بھی شعائر کا درجہ حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسرے مذاہب میں شعار: یہ اسلام میں تو تعلق باللہ کا ذریعہ ہیں مگر دوسری اقوام ومذاہب میں بھی انکے اپنے اپنے شعار، علامات یا شناخت کے ذرائع ہیں۔ بلکہ بعض اقوام میں یہ شناخت وعلامت بطور اشیاء عبادت استعمال ہوتے ہیں۔

چینی زبان میں حروف کو بھی سمبل علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور انھیں بطور زیور یا بطور نکلس گلوں میں آویزاں کیا جاتا ہے۔ بعض دوسرے لوگ مثلاً "Shamanic لوگ TAO.SHINTO.DAVINCI CODE ETC کے ڈیزائین کا ہار پہنتے ہیں۔ جاپان میں بدھ مت کے لوگ بدھا کی شکل۔ فری میسن کا نشان۔ متبرک سمجھتے ہیں۔ خالصہ سکھ لوگ کنگھا، کرپان، کچھا سروں اور دوسرے بالوں کا نہ کاٹنا سے اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں۔ ہندو لوگ سر کی چٹیا جنیو کا دھاگا وغیرہ کو اپنی شناخت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

Ref Avisual ylossary of Eeligious Symbols About out .com

Alternative Riligions.http://altretion.about.com

درج بالا دونوں Web Sites پر سینکڑوں سمبل یا علامات دیے گئے ہیں۔ جنکا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

فارمولا برائے منتقلی کیلنڈر: اب ایک مفید معلومات پیش کرتا ہوں۔ یوں تو بہت سے طریقے موجود ہیں۔ مگر آسان طریقہ یہ ہے جس کو استعمال کر کے ہم سنہ ہجری کا عیسوی سال یا فقط سنہ اگر معلوم ہو تو اس سے سنہ ہجری معلوم کر سکتے ہیں۔

Gregarian year =[(32*Higrayear)/33]+632

Higra year =[(gregarianyear-622)33]/32

نوٹ: بعض اوقات گریگوری اور اسلامی ہجری سال ساتھ ساتھ بھی آجاتے ہیں مثلاً جنوری ۲۰۰۸ء میں ۱۴۲۸ھ کے آخری ایام شامل ہے اور اسی ۲۰۰۸ء میں ۱۴۲۹ھ کا پورا سال شامل ہے۔ ۱۴۳۰ھ کے شروع کے ایام دسمبر ۲۰۰۸ء میں شامل ہونگے۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ ۲۰۰۸ء اور ۱۴۲۹ھ ساتھ ساتھ چلتے نظر آئینگے۔

اختتام

کسی عنوان پر کوئی بھی تحریر آخری کلام نہیں ہو سکتی اسلامی ہجری کیلنڈر کی تدوین، ترویج اور اسکے نفاذ کا مسئلہ کوئی بڑا پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم بعض اخباروں، رسالوں اور کیلنڈر پر عیسوی تاریخوں کے ساتھ ہجری تاریخیں بھی دیکھتے ہیں۔ مگر یہ خال خال ہیں۔ اسلامی ہجری کیلنڈر کی جو پذیرائی اور اہمیت ہمارے پاکستانی اسلامی معاشرہ میں ہونی چاہیے وہ نظر نہیں آتی۔

لہٰذا شعار اسلامی کی حفاظت کے لئے اور یاد دہانی کے لئے یہ تحریر پیش کی گئی ہے۔ امید کہ دوسرے محققین اور دانشور بھی آگے آئیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ. علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم.

مزارعت اور قرآن مجید

مولانا محمد طاسینؒ

چونکہ اسلامی شریعت وقوانین کا اصل الاصول اور حقیقی ماخذ و سرچشمہ قرآن مجید ہے لہٰذا سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اس معاملہ کے متعلق کیا ہدایت و راہنمائی ہے۔ وہ اسے جائز قرار دیتا ہے یا ناجائز ٹھہراتا ہے، اس کا جواب دینے سے پہلے مناسب و مفید ہوگا کہ اصولی بات عرض کر دی جائے اور وہ یہ کہ ہم جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہدایت کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل کتاب ہے اور اس میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ سے متعلق ہدایت و راہنمائی موجود ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ حیات انسانی کے تمام جزوی مسائل کے متعلق اس کے اندر تفصیلی احکام پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ بدیہی طور پر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اس وجہ سے کہ قرآن مجید میں ایسے جزوی مسائل بہت تھوڑے سے ہیں جن کے متعلق صراحت کے ساتھ تفصیلی احکام مذکور ہیں اور چونکہ زندگی کے جزوی مسائل بے شمار اور لاتعداد ہیں۔ لہٰذا ناممکن ہے کہ کوئی ایک کتاب ان لاتعداد مسائل اور ان کے متعلق جزوی و تفصیلی احکام پر محیط و حاوی ہو خواہ وہ سینکڑوں جلدوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، بلکہ ہمارے اس دعوے کا صحیح مطلب یہ ہوتا اور یہ ہی ہو سکتا بھی ہے کہ قرآن مجید اصول و مبادی اور بنیادی افکار و تصورات کے لحاظ سے جامع و کامل کتاب ہدایت ہے۔ یعنی اس کے اندر وہ اصول کلیہ اور مبادی عامہ بتمام و کمال موجود ہیں جو حیات انسانی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے اور ہر شعبہ کے جزوی مسائل کے لئے راہنمائی و روشنی دیتے ہیں اور کی راہنمائی و روشنی میں ہر مسئلے کا قرآنی حل سمجھا اور دریافت کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں بعض جزوی مسائل سے متعلق جو تفصیلی احکام ہیں غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی قرآن کے اساسی اصول و تصورات پر مبنی ہیں اس طرح صحیح احادیث میں جزوی مسائل کے متعلق جو تفصیلات ہیں وہ بھی دراصل قرآن حکیم کے بنیادی اصول و ضوابط اور اساسی افکار و تصورات کی علمی تشریح و توضیح ہیں اور ان کا قرآن مجید سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔

لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ قرآن مجید میں زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو سے متعلق جو اصول کلیہ اور مبادی عامہ ہیں وہ اس اسلوب بیان سے نہیں جس اسلوب بیان سے وہ وضعی علوم سے متعلق انسانی تصنیفات میں ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ کہ ان میں اصول کلیہ اور مبادی عامہ کا الگ، مستقل اور مجرد ذکر ہوتا اور ان کی وضاحت کے لئے جزوی مثالوں کا الگ ذکر ہوتا ہے جیسے کہ ہم عمرانیات، معاشیات، سیاسیات، ریاضیات، طبیعیات، فقہ و قانون، اصول الفقہ، منطق اور صرف و نحو وغیرہ کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ جبکہ قرآن مجید میں وہ اصول و مبادی پہچانے جزیوں کے ضمن میں مذکور ہیں اور ان کو صرف وہی لوگ جان اور سمجھ سکتے ہیں جو غور و فکر اور استنباط و استخراج کی ممتاز صلاحیت اور استدلال کے مختلف طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

دراصل اس بارے میں قرآن کریم کا اسلوب و طریقہ یہ ہے کہ وہ جب ایک نوع کے کثیر التعداد مسائل کے متعلق اپنا کوئی کلی حکم دینا چاہتا ہے کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز تو وہ ان مسائل میں سے ایک ایسے مسئلہ کے متعلق حکم دیتا ہے جو عام طور پر معروف اور جانا پہچانا ہوتا ہے، اس میں گویا وہ یہ فرماتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ میرے نزدیک جو حکم اس خاص مسئلے کا ہے، جس کی حقیقت و ماہیت کو تم جانتے پہچانتے ہو۔ یہی حکم ہر اس مسئلے کا ہے جو اپنی ماہیت و حقیقت، اپنی روح و اسپرٹ اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے اس خاص مسئلہ سے ملتا جلتا اور مماثلت و مشابہت رکھتا ہے۔ اس طرح ایک جزیے کے ضمن میں کلیہ مذکور ہوتا ہے، استدلال کے اس طریقہ کا نام منطق میں تمثیل اور اصول الفقہ میں قیاس ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو استدلال کا یہ طریقہ کئی وجوہ سے بہتر اور احسن طریقہ ہے اس وجہ سے بھی کہ یہ آسان و سہل ہے۔ کیونکہ ایک معلوم جزیے کے ذریعے دوسرے نامعلوم جزیے کا علم حاصل کرنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت اس علم کے جو ایک کلیے کے ذریعے نامعلوم جزیے کا حاصل کیا جاتا ہے، یعنی ایک جزیے سے دوسرے جزیے کو سمجھنا آسان ہوتا ہے، بمقابلہ ایک کلیے سے جزیے کو سمجھنے کے، یہ اس لئے کہ جزئیہ خارج میں اور محسوس ہوتا ہے جبکہ کلیہ ذہن میں اور غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ محسوس سے محسوس پر استدلال آسان ہوتا ہے بہ نسبت غیر محسوس یعنی معقول سے محسوس پر استدلال سے اور اس وجہ سے بھی یہ طریقہ استدلال بہتر و احسن ہے کہ اس میں غلطی کا امکان کم ہوتا ہے یعنی کلیے کو جزیے پر منطبق کرنے میں غلطی کے احتمال سے، کیونکہ کلیے کو جزیے پر منطبق کرنے میں عقل کا زیادہ دخل ہوتا ہے جبکہ جزیے کو جزیے پر منطبق کرنے میں حواس ظاہری کا دخل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہلا طریقہ

موضوعی نوعیت کا اور دوسرا طریقہ معروضی نوعیت کا ہے یا یوں کہئے کہ پہلا استخراجی اور دوسرا استقرائی ہے، علاوہ ازیں قرآن کا تعلیم کردہ طریق استدلال فطری ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ سن شعور سے پہلے ایک بچہ بھی اسی طریق استدلال سے کام لیتا ہے اور فطرتاً اس سے مانوس ہوتا ہے۔ وہ ہر اس دوسری چیز کو پسند کرتا ہے جو اس کی پہلی پسندیدہ چیز کے مماثل ہوتی اور ہر اس چیز سے گریز کرتا ہے جو اس کی پہلی گریز شدہ چیز سے مماثلت رکھتی ہے۔

غرضیکہ اصول کلیہ اور مبادی عامہ کے بیان میں قرآن مجید کا جو اسلوب ہے وہ نسبتاً آسان، غلطی سے محفوظ، حسی اور فطری اسلوب ہے لہٰذا ایک بہتر اور احسن اسلوب ہے۔

معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق قرآن حکیم کا جو اصل کلی اور مبدأ عام ہے وہ بھی اسی اسلوب سے بیان کیا گیا ہے یعنی دو جزوی معاملات سے متعلق دو مختلف حکموں میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمان الٰہی ہے:

واحل اللہ البیع وحرم الربو

''اور اللہ نے معاملہ بیع کو حلال اور معاملہ ربٰو کو حرام ٹھہرایا''

قرآن حکیم کی اس آیت میں بظاہر دو جزوی اور مخصوص معاشی معاملات کے متعلق دو مختلف حکم ہیں۔ معاملہ بیع کے متعلق یہ حکم کہ وہ حلال و جائز ہے اور معاملہ ربٰو کے متعلق یہ کہ وہ حرام و ناجائز ہے۔ لیکن یہ دو حکم ان دو معاملوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ان کی طرح کے دیگر تمام معاملات کے لئے عام ہیں، گویا اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر وہ معاشی معاملہ جو اپنی ماہیت و حقیقت، بناوٹ و ساخت، روح و اسپرٹ اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملہ بیع کے مشابہ و مماثل ہو وہ حلال و جائز اور ہر وہ معاملہ جو اپنی حقیقت و ماہیت، اپنی روح و غایت اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملہ ربٰو سے مماثلت و مشابہت رکھتا اور ملتا جلتا ہو وہ حرام و ناجائز ہے۔ اس طرح اس آیت میں گویا دو قاعدے کلیے بیان کئے گئے ہیں جن کی روشنی میں کثیر التعداد معاشی معاملات کے بارے میں قرآنی حکم معلوم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ کونسے معاملات آتے ہیں جو معاملہ بیع سے کامل مشابہت رکھتے ہیں دوسری قسم کے معاملات میں وہ تمام معاملات داخل ہیں جو معاملہ رٰبو سے کامل مماثلت رکھتے ہیں اور تیسری قسم کے معاملات میں وہ جملہ معاملات آتے ہیں جو ایک پہلو سے معاملہ بیع سے مشابہ اور دوسرے پہلو سے معاملہ رٰبو سے مشابہ ہوتے ہیں۔

معاملہ بیع کی حقیقت و ماہیت جو عام طور پر جانی پہچانی ہے یہ کہ اس میں تاجر اپنے سرمائے کے ساتھ خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور نفع کماتا ہے لہٰذا اس معاملے میں تاجر کو اپنے اصل سرمائے پر بطور نفع جو زائد مال ملتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے دماغی و جسمانی محنت و مشقت موجود ہوتی ہے۔ اس کی دماغی محنت وہ ہوتی ہے جو وہ سامان تجارت خریدنے اور بیچنے سے پہلے سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے کہ کیا چیز کہاں سے اور کب خریدنے اور پھر کہاں اور کب فروخت کرے، اور اس کی جسمانی محنت و مشقت وہ دوڑ دھوپ اور تگ و دو ہوتی ہے جو وہ ادھر ادھر جانے آنے، سامان خریدنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے اور اس کی حفاظت و دیکھ بھال کے سلسلہ میں کرتا ہے، بنابریں ہر وہ معاشی معاملہ معاملہ بیع کے مشابہ و مماثل قرار پائے گا جس میں حاصل ہونے والے زائد مال اور منافع کے بالمقابل آدمی کی دماغی جسمانی محنت و مشقت موجود ہوتی ہے۔

اور معاملہ ربوٰ کی حقیقت و ماہیت جسے سب کاروباری لوگ جانتے پہچانتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو استعمال کے لئے بطور قرض دیتا ہے اور شرط لگاتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اسے اس کا اصل مال مع اضافے کے واپس کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اس میں مقرض یعنی قرض دینے والے کے لئے اس کا اصل مال بھی بغیر کسی نقصان کے پوری طرح محفوظ رہتا ہے۔ کیونکہ مقررہ وقت پر اس کے ادا کرنے کی قانونی ضمانت موجود ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اس کے بدلے اس کی طرف سے مقروض کے لئے کوئی مادی شے موجود ہوتی ہے جو اس زائد مال سے مماثلت رکھتی ہو اور نہ کوئی پیدا آور محنت موجود ہوتی ہے جس کی اجرت اس زائد مال کے برابر ہو۔ لہٰذا ہر وہ معاشی معاملہ، معاملہ ربوٰ کے مماثل و مشابہ ٹھہرتا ہے جس میں ایک فریق کا مال دوسرے کے استعمال میں اس قانونی تحفظ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ مال جب واپس ہوگا تو بغیر کسی پیدا آور محنت کے دوسرے سے کچھ زائد مال اس وجہ سے لیتا ہے کہ دوسرے نے اس کا مال استعمال کیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن مجید نے معاملہ بیع کو کیوں حلال اور معاملہ ربوٰ کو کیوں حرام ٹھہرایا اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ تو مختصر طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ معاملہ بیع کو اس لئے حلال و جائز ٹھہرایا ہے کہ یہ عدل کے مطابق ہے کیونکہ اس میں فریقین آپس میں جو دیتے لیتے ہیں ایک دوسرے کا حق سمجھ کر دیتے لیتے ہیں اور اس میں ان کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے جو معاملے کی صحت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے، کچھ واضح الفاظ میں یہ مطلب یہ کہ معاملہ بیع میں تاجر اپنے اصل سرمائے پر خریدار سے جو زائد مال لیتا ہے یعنی

مثلاً سو روپے میں خریدی ہوئی چیز ایک سو دس میں بیچ کر جو دس روپے زائد لیتا ہے اس زائد کے عوض چونکہ اس کی طرف سے محنت موجود ہوتی ہے جو سب کے نزدیک پیدائش دولت کا متفقہ اور مسلمہ عامل ہے لہٰذا وہ اس زائد مال کا حقدار ٹھہراتا ہے اور خریدار اسے حقدار سمجھ کر وہ زائد مال اس کو برضا و خوشی دیتا ہے گویا اس محنت کی اجرت کے طور پر اسے دیتا ہے جو اس نے خرید و فروخت کے سلسلہ میں کی ہوتی ہے۔ بہرحال اس معاملے میں اصل ماہیت میں کسی فریق کی حق تلفی داخل نہیں۔ لہٰذا یہ ظلم کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ عدل و قسط کی تعریف میں آتا ہے جس کا قیام و تحفظ اسلام کا بڑا مقصد اور نصب العین ہے۔

اور معاملہ ربوٰ کے حرام ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کی ماہیت اور فطرت میں ظلم و حق تلفی ایک لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہے، اس میں مقرض اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال کے ساتھ جو کچھ بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی طرف سے اس زائد مال کے بالمقابل کوئی ایسی حقیقی شے موجود نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ اس کا حقدار ٹھہرتا ہو نہ کوئی پیداوار محنت و مشقت موجود ہوتی ہے جو حق کی بنیاد ہے اور نہ کوئی نقصان وغیرہ کی شکل میں مادی شے موجود ہوتی ہے جو اس زائد مال کا عوض بن سکتی ہو، پھر چونکہ قرض پر دی ہوئی چیز مقرض کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور اس کی حیثیت بالکل وہی ہو جاتی ہے جو اس کی کسی دوسری مملوکہ چیز کی ہو جاتی ہے وہ اس کے ساتھ محنت و مشقت کر کے جو کچھ کماتا ہے وہ سب اسی طرح اس کا حق ہوتا ہے جس طرح اپنے کسی دوسرے مال کے ساتھ محنت کر کے کمایا ہوا مال، اسی طرح مقروض، بطور قرض دیے ہوئے مال کے استعمال پر کوئی کرایہ وغیرہ بھی نہیں لے سکتا۔ کیونکہ کرائے کیلئے ضروری ہے کہ کرائے پر دی ہوئی چیز اس کی ملکیت میں ہو جس نے کرایہ پر دی ہے کیونکہ قرض پر دیا ہوا مال اب اس کی ملکیت نہیں بلکہ مقروض کی ملکیت ہو جاتا ہے، نیز کرائے کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ کرائے پر دی جانے والی چیز ایسی ہو جس کے استعمال ہونے سے قیمت و مالیت متحقق ہو اور مدت کرایہ ختم ہونے پر مالک کی طرف بعینہٖ نہیں بلکہ نقصان کے ساتھ لوٹتی ہو۔ حالانکہ قرض کا مال جب قرضخواہ کی طرف لوٹتا ہے تو بغیر کسی نقصان کے پورے کا پورا لوٹتا ہے، بہرحال معاملہ ربوٰ میں سود خوار اپنے اصل مال سے زائد لیتا ہے۔ وہ کسی طرح اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ اس مقروض کا حق ہوتا ہے جس سے وہ لیتا ہے۔ لہٰذا ظلم و حق تلفی، اس معاملے کی ماہیت کا جزو لاینفک ہے۔ اور ظلم و حق تلفی ہے لہٰذا یہ معاملہ بھی حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس معاملے میں ایک فریق حقیقی رضا و خوشی کے ساتھ شریک نہیں ہوتا بلکہ اس مجبوری کے تحت شریک ہوتا ہے کہ اس کے پاس حسب